نقوشِ فکر و ادب

از

مولانا سید محمد واضح رشید حسنی ندوی
(معتمد تعلیم ندوۃ العلماء لکھنؤ)

ترتیب و پیشکش

محمد وثیق ندوی

ناشر
دار الرشید
لکھنؤ

جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ ہیں

۱۴۳۹ھ - ۲۰۱۸ء

نام کتاب	:	نقوش فکر وادب
مؤلف	:	مولانا سید محمد واضح رشید حسنی ندوی
ترتیب وپیشکش		محمد وثیق ندوی
صفحات	:	۱۶۰
تعداد	:	گیارہ سو
قیمت	:	Rs.140

ملنے کے پتے

مجلس تحقیقات ونشریات اسلام، لکھنؤ، فون:0522-2741539

مکتبہ اسلام، گوئن روڈ، امین آباد، لکھنؤ، فون:9415912042

مکتبہ ندویہ، احاطہ ندوۃ العلماء، لکھنؤ، فون:9335070285

مکتبہ احسان، مکارم نگر، لکھنؤ، فون:9793118234

مکتبۃ الشباب العلمیۃ، شباب مارکیٹ، مکارم نگر، لکھنؤ9696437283

الفرقان بکڈپو، نظیر آباد، لکھنؤ :(0522)2610443. 6535664

ناشر

دار الرشید Dar Al Rasheed

164/106 Khatoon Manzil, Haidar Mirza Road
Golaganj, Lucknow. Mo: 9452294097-9838154415
e-mail:daralrasheed17@gmail.com

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

فہرست

پیش گفتار ۹

مقدمہ ۱۱

عالمی رابطہ ادب اسلامی: ایک تعارف ۱۴

قرآن کریم کا اعجاز واسلوبِ بیان

قرآن مجید کا اعجاز لامحدود ہے ۲۴

قرآن کی امتیازی صفات ۲۴

قرآن کا اعجاز ۲۵

اعجاز بیانی ۲۶

اعجاز علمی ۲۸

اعجاز قرآن کا تنوع ۲۹

قرآن کریم میں قصہ نگاری اور دینی اور فنی مقاصد کا حسین امتزاج ۳۰

قرآن میں قصہ بیان کرنے کا مقصد ۳۱

قصہ نگاری کے مختلف اسالیب بیان ۳۲

سورہ کہف میں منظر کشی ۳۳

سورہ مریم میں منظر کشی ۳۴

ابراہیم علیہ السلام کا تاثر	۳۵
حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی خواہش	۳۶
ترجمہ قرآن: فن اور مشکلات	۳۹
مفسر اور مترجم قرآن کے لیے شرائط	۴۰
قرآنی الفاظ کی شرح میں متقدمین کی احتیاط	۴۱
ترجمۂ قرآن کی دشواریاں	۴۱
ترجمۂ قرآن کے لیے بنیادی ضرورت	۴۵
قرآن کے اعجازی پہلو	۴۶
پرخطر کام	۴۶
اردو میں قرآن کے تراجم	۴۷
پرامن معاشرہ: قرآنی نقطۂ نظر	۵۰
نیک اور صالح انسان کا قرآنی تصور	۵۰
اسلامی تربیت اور اس کا سرچشمہ	۵۱
اسلامی معاشرہ	۵۱
انسانی فطرت اور اسکے تقاضوں کی رعایت	۵۲
امن عالم کا اعلامیہ	۵۳
کرامت انسانی کی پاسداری	۵۶
احترام انسانیت	۵۷
مذاہب کا احترام	۵۸
اخلاق کی تعلیم	۵۸
مومن کی شان	۶۰

کلام رسول صلی اللہ علیہ وسلم

کی ادبی وفنی خصوصیات اور اس کا تربیتی پہلو

کلام رسول کا ادبی مقام ومرتبہ اور تربیتی پہلو	۶۲
بہترین کلام	۶۲
قرآنی ادب کا اثر اور موضوعات کا تنوع	۶۳
افصح العرب	۶۳
ادب نبوی کی بلاغت وتاثیر اور اساطین زبان وادب کا اعتراف	۶۴
الہامی اسلوب	۶۹
ادب نبوی سے متعلق اہم تصنیفات ومعلومات	۶۹
سیرت وکردار کی میزان	۷۱
حدیث نبوی میں منظر کشی کے چند نمونے	۷۳
بااخلاق انسان اور بداخلاق انسان کی مثال	۷۳
ریاکاری اور حب جاہ کی مثال	۷۵
واقعہ نگاری اور نفسیاتی حالت کی منظر کشی	۷۶
شکر اور ناشکری کی مثال	۷۸
ماں کی گود میں بات کرنے والے تین بچوں کا قصہ	۷۹
پڑوسی اور مہمان کا اکرام	۸۳
نعت گوئی	۸۴
نعت گوئی کی ابتداء	۸۵

اردو اور فارسی کے نعت گو شعراء ۸۵
نعتیہ کلام کی خصوصیات ۸۷

حقیقی ادب

شاعری اور اسلام ۹۰
اہل دل کا کلام ۹۳
قلب کی قسمیں ۹۳
سچے کلام کی تاثیر ۹۵
اہل دل کا ادب ۹۵
چند مشہور اہل دل ۹۶
ہندوستان کے صلحاء ۹۷
امام حسن بصری کے مواعظ کی تاثیر و بلاغت ۹۸
کلام اہل دل کی تاثیر کا راز ۹۹
ادب میں سوز دروں اور خون جگر کی اہمیت ۱۰۰
مواعظ و ملفوظات کی تاثیر ۱۰۲
سوانحی ادب اور تعمیری قدریں ۱۰۴
اسلامی ادب میں سوانح نگاری ۱۰۷
اسلامی ادب میں ذرائع ابلاغ کی اہمیت اور اس کے اسلامی اصول و اقدار ۱۱۰
ابلاغ کا مفہوم ۱۱۰
یورپ کا دجل و فریب اور ذرائع ابلاغ کا غلط استعمال ۱۱۰

شر وفساد کا ذریعہ	۱۱۲
مغربی میڈیا کی تخریب کاری	۱۱۲
دروغ گوئی	۱۱۳
موجودہ میڈیا	۱۱۳
عالمی میڈیا کا رویہ	۱۱۴
ذرائع ابلاغ صہیونی شکنجہ میں	۱۱۵
اسلام پر میڈیا کی یلغار	۱۱۶
ذرائع ابلاغ کی طاقت	۱۱۷

گنج ہائے گرانمایہ

اردو زبان پر اسلامی اثرات	۱۲۰
اردو زبان	۱۲۰
اردو زبان کا ارتقاء اور مسلم سلاطین وامراء	۱۲۰
اردو زبان کی ترویج میں مصلحین اور علماء ربانیین کا حصہ	۱۲۳
اسلامی چھاپ	۱۲۴
اردو ادب اور اسلام اور ملت اسلامیہ کی خدمت	۱۲۵
اردو ادب اور قومیت اسلامیہ	۱۲۸
علامہ شبلی نعمانیؒ	۱۲۸
علامہ اقبالؒ	۱۲۹
مغربی تہذیب پر تنقید	۱۳۰
اکبر حسین الہ آبادیؒ	۱۳۲

اردو نثر	۱۳۵
اردو صحافت	۱۳۷
مولانا ابوالکلام آزادؒ	۱۳۷
مولانا حکیم سید عبدالحی حسنیؒ	۱۴۰
اسلامی جذبہ کی تاثیر و دلآویزی	۱۴۱
اردو ادب میں قصہ نگاری	۱۴۵
علماء گجرات اور ان کی ادبی و علمی خصوصیات	۱۴۸
گجرات کی تاریخی اور جغرافیائی حیثیت	۱۴۹
سرزمین گجرات کا امتیاز	۱۵۰
گجرات کے ممتاز علماء	۱۵۱
گجراتی امراء کی علم پروری	۱۵۲
شیخ علاء الدین علی مہائمیؒ	۱۵۳
علامہ محمد طاہر پٹنیؒ	۱۵۳
اردو زبان و ادب کے ارتقاء میں دکن کا حصہ	۱۵۵
مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ کا اسلوب نگارش	۱۵۸

پیش گفتار

الحمد للہ رب العالمین والصلاۃ والسلام علی سید الأنبیاء وخاتم المرسلین محمد وعلی آلہ وصحبہ أجمعین وبعد۔

رابطہ ادب اسلامی کے سیمیناروں کے لیے لکھے گئے والد محترم مولانا سید محمد واضح رشید حسنی ندوی کے مقالات کا پہلا مجموعہ آپ کے ہاتھ میں ہے، آپ نے یہ مقالات مختلف موضوعات پر تحریر فرمائے، جو نہ صرف یہ کہ ان سیمیناروں میں پڑھے گئے؛ بلکہ مختلف اخبارات ورسائل میں اہتمام کے ساتھ شائع بھی کیے گئے۔

رابطہ ادب اسلامی کے سیمیناروں کے لیے تحریر کردہ سکریٹری جنرل رابطہ ادب اسلامی کے مقالات کی فہرست یوں تو بہت طویل ہے، لیکن کتاب کو ضخامت سے اور قاری کو اکتاہٹ سے بچانے کے لیے یہ شکل زیادہ مناسب لگی کہ ان مقالات کو کئی مجموعات میں تقسیم کردیا جائے، جن کا چھپنا بھی آسان، پڑھنا بھی آسان اور بطور ہدیہ دینا بھی آسان۔

معتمد تعلیم ندوۃ العلماء مولانا سید محمد واضح رشید حسنی کا مضمون ہو یا مقالہ، کتاب ہو یا کتابچہ، اس کی اپنی ایک الگ پہچان ہوتی ہے فکر میں جو اس میں پیش کی گئی، اسلوب میں جس میں اس کو ڈھالا گیا، معلومات میں جو اس میں فراہم کی گئیں، پیغام میں جو اس کے ذریعہ قاری کو دیا گیا، جاذبہ میں جو پڑھنے والے کو اس میں نظر آیا، یہی وجہ ہے کہ آپ کی ہر تحریر شوق سے پڑھی جاتی ہے اور اس سے روشنی حاصل کی جاتی ہے۔

آپ کے ہاتھوں تک یہ مجموعہ پہنچانا ہمارے لیے باعث سعادت بھی ہے اور باعث مسرت بھی اور ساتھ ساتھ علم، ادب اور دین کی ایک خدمت بھی، ہم مشکور ہیں مولانا محمد وثیق ندوی کہ انہوں نے ان مقالات کو فائلوں سے نکالا، ترتیب قائم کی اور طباعت کے

مرحلہ تک پہنچایا، انہیں اس کام کا سلیقہ بھی ہے، ذوق بھی ہے اور اس کام سے طبعی مناسبت بھی، وہ یہ کام اپنے شوق سے کرتے ہیں اور بغیر کسی منفعت کے۔ ان کو صاحب مقالات سے طبعی مناسبت بھی ہے اور ان کے ذوق وفکر سے واقفیت بھی، ایک عرصہ تک ان کی علمی معاونت کا تجربہ بھی ہے، مقالات کے اس انتخاب میں اس کا خیال رکھا ہے اور اسلوب سے مناسبت کا بھی بڑا دخل ہے۔

امید ہے کہ یہ مجموعہ شوق سے پڑھا جائے گا اور اس سے فائدہ اٹھایا جائے گا۔

جعفر مسعود حسنی ندوی

۱۳/ربیع الاول/۱۴۳۹ھ

۳/دسمبر/۲۰۱۷ء

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مقدمہ

مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی، ناظم ندوۃ العلماء لکھنؤ

الحمد لله رب العالمين، والصلاة والسلام على سيد المرسلين وخاتم النبيين سيدنا محمد، وعلى آله وصحبه أجمعين، وبعد!

اللہ تعالیٰ نے انسان کو جب زمین پر بسایا تو زمین میں اس کی زندگی کے حسب ضرورت جینے کے لیے جن مادی وسائل کی حاجت تھی، وہ عام حیثیت سے زمین میں رکھ دیے اور جن معنوی وسائل کی حاجت تھی، وہ اس کی فطری صلاحیتوں کی صورت میں رکھ دیے، ان میں زبان کا ذریعہ آپس میں ترجمانی کے لیے عطا فرمایا اور اس کو حسب ضرورت استعمال کرنے کے لیے عقل کا ذریعہ عطا کیا، انسانی عقل اس ذریعہ کو علم کے حصول، اس کی حفاظت اور اس کی حسب ضرورت ترجمانی کے لیے اختیار کرتی ہے اور اس طرح انسان کی زندگی تمام زمینی مخلوقات کے مقابلہ میں متنوع اور اعلیٰ سطح سے عمل میں آتی ہے۔

اللہ رب العزت نے انسان کو یہ صلاحیتیں بلا مقصد نہیں دیں، اس کو ان صلاحیتوں کو بامقصد استعمال کا حکم دیا اور صحیح استعمال نہ کرنے پر اس کا نقصان بتایا؛ لیکن انسان زمینی مخلوق ہونے کی بنا پر خواہشات بھی رکھتا ہے اور ان کے اثر سے غلطیاں کرتا ہے، اسلام نے ہم سب انسانوں کو ان صلاحیتوں کے صحیح استعمال کے طریقے بتائے ہیں، اس میں علم اور فن دونوں کا استعمال بھی آتا ہے، فن میں ادب کی قسم اپنے اندر علمی خوبیاں بھی رکھتی ہے، ان خوبیوں کا لحاظ اعلیٰ مقصد کے لیے بخوبی کیا جا سکتا ہے، اسلامی رہنمائی ہم کو اس کی تلقین کرتی ہے اور اس خوبی

کا خیال بہت اچھے انداز سے انسانی اقدار کا لحاظ کرنے والے سب لوگوں نے کیا ہے۔

اسلام کی آمد سے قبل عربوں میں شاعری کا عام رواج تھا، جس کے ذریعہ وہ اپنے دلوں کے احساسات موثر انداز سے ظاہر کرتے تھے اور دوسروں کے احساسات ابھارنے کے لیے ذریعہ بناتے تھے، بعض وقت ان کی اس سلسلہ کی ہنرمندی کا انقلابی اثر ظاہر ہوتا تھا اور متاثر ہونے والوں کی صورتحال میں تبدیلی بھی واقع ہوجاتی تھی، اس عہد کے یہ عرب پڑھے لکھے نہ تھے، اس کی بناپر علم کی لائن میں ان کی کوئی پیش رفت نہ تھی، وہ اس کی ضرورت بھی شعروشاعری سے پوری کرتے تھے، چنانچہ اس عہد کے عربوں کی زندگی کے طور طریق سے واقفیت کا ذریعہ ان کی شاعری بنی، اس بناپر "الشعر دیوان العرب" کا جملہ کہا گیا کہ شاعری عربوں کی زندگی کی تاریخ ہے۔

علمی لائن نہ ہونے کی بناپر عربوں نے نثر کو عام طور پر اپنی زندگی کا موثر ترجمان نہیں بنایا، لیکن جب اسلام آیا اور پہلی آسمانی وحی میں علم وقلم کا حوالہ دیا گیا اور خود کلام الٰہی جو عربوں کی استعمالی زبان کے اس انداز میں نازل ہوا جو انسانی تعبیر وزبان کا معجزانہ اسلوب بیان رکھتا ہے، تو ان کے چوٹی کے ایک شاعر نے کہا کہ اب شاعری کیا کریں، قرآن کی موجودگی میں اس کا کیا فائدہ، قرآن مجید اور اس کے اسالیب بیان کا یہ اثر پڑا کہ شاعری سے نثر کی طرف توجہ کا سلسلہ شروع ہوگیا اور نثر ذریعہ ابلاغ ہی نہیں؛ دلوں کی ترجمانی کرنے لگی، اس کے نمونے حضور صلی علیہ وسلم کے کلام سے لے کر عہد جدید تک کے اصحاب صلاحیت حضرات کے کلام میں ملتے ہیں، ہمارا ادب اسلامی ان ہی کی پیروی اختیار کرتا ہے۔

دلوں کی ترجمانی خواہ شاعری سے ہو یا نثر سے ہو، ادب کے لفظ سے ظاہر کی جاتی ہے، اس لفظ کے اصل معنی اخلاق واعمال کی شائستگی اور خوبی کے ہیں اور سنجیدہ انسانی نقطہ نظر رکھنے والے ادب کے لفظ میں اس صفت کو انسانی اقدار کا تقاضہ سمجھتے ہیں، لیکن انسانی اقدار کی پابندی کو جن افراد نے کلام انسانی کے پیروں کی زنجیر سمجھا، انہوں نے ادب کی کسی قید کو قبول کرنے سے صرف نظر کیا؛ بلکہ مزید آگے بڑھ کر اس کو غلامی سمجھا، چنانچہ ادب نے وہ آزادی اختیار کرنا شروع کردی جو بالکل بے لگام ہوگئی اور بتدریج ایسا حال بنادیا گیا

جیسا کہ غسل خانہ سے کوئی شخص بغیر کپڑے پہنے باہر آجائے اور گفتگو کرنے لگے۔

بہر حال ہم ارکان رابطہ ادب اسلامی جو اسلامی اقدار کو اعلی انسانی اقدار کی حیثیت دیتے ہیں، ادب کو اس کے بنیادی مضمون کے لحاظ سے اس کی معیاری صفت کی طرف توجہ دلانے کے لیے اسلامی کی اصطلاح مناسب سمجھتے ہیں، جس سے ادب کے باادب اور انسانی اقدار کا پابند ہونے کی راہ بحال ہو سکے اور الحمد للہ یہ کوشش پسند کی جارہی ہے اور ہمارے رابطہ ادب اسلامی کا یہ سفر الحمد للہ رواں دواں ہے۔

رابطہ ادب اسلامی نے اپنے قیام کے وقت سے اسی ادب کو متعارف بنانے اور اچھی مثالیں پیش کرنے کے لیے عالمی اور علاقائی سطح پر سیمینار منعقد کیے جن میں نئے نئے موضوعات پر مقالات پیش کیے گئے، ان سیمیناروں میں صدر جلسہ کا خطاب ادبی جائزہ کا انداز رکھتا رہا ہے اور رابطہ کے سکریٹری جنرل کا خطاب رابطہ کی کارکردگی کے حوالہ سے توضیحی اور توجیہی انداز کا ہوتا رہا ہے۔

گزشتہ سیمیناروں میں رابطہ کے سکریٹری جنرل مولانا سید محمد واضح رشید حسنی ندوی صاحب (معتمد تعلیم ندوۃ العلماء) نے بڑے اچھے استقبالیے پیش کیے، مولانا محمد واضح رشید حسنی صاحب کا علم ومطالعہ تاریخ ادب اسلامی اور عصر جدید کے ادبی اصناف دونوں کا اچھا رہا ہے، جو ان کی سالانہ سکریٹری رپورٹوں میں جھلکتا ہے اور اس سے موضوع پر اچھی افادیت سامنے آتی ہے، ان کا ایک انتخاب ان کے علمی معاون مولوی محمد وثیق ندوی نے انتخاب کر کے بطور کتاب تیار کر دیا ہے جو قارئین کی خدمت میں پیش ہے، ان شاء اللہ اس کی افادیت سامنے آئے گی، میں ان کی اس کوشش کو لائق قدر سمجھتا ہوں، اللہ تعالی ان کی اس کوشش کو قبول فرمائے اور زیادہ سے زیادہ نافع بنائے اور یہ سلسلہ جاری رکھے۔ (آمین)

۲۳ ربیع الاول ۱۴۳۹ھ — محمد رابع حسنی ندوی

۱۳ دسمبر ۲۰۱۷ء — ندوۃ العلماء، لکھنؤ

عالمی رابطہ ادب اسلامی: ایک تعارف

رابطہ ادب اسلامی ایک عالمی تنظیم ہے جس کا بنیادی مقصد اخلاق، مذہب اور ادب، علم اور ادب اور فکر وفن کے مختلف شعبوں میں کام کرنے والوں کے درمیان رابطہ اور تعلق پیدا کرنا ہے، اس کا مقصد بہت بلند اور اعلیٰ وارفع ہے، اور وہ ہے انسانی زندگی کی تعمیر وتشکیل، اخلاق کی اصلاح و درستگی، اور انسان کی صلاحیتوں کو دوسرے انسانوں اور انسانیت کی فلاح و بہبود میں صرف کرنا، اور زبان وقلم کو ان کی آلائشوں اور خرابیوں سے پاک کرنا۔ اور یہ حقیقت ہے کہ زبان و قلم کے غلط استعمال سے ہر دور میں انسانوں پر مصیبتیں اور پریشانیاں آئی ہیں، کیونکہ ادب کے بارے میں یونانی فکر کے اثر سے یہ سمجھا جاتا ہے کہ ادب نام ہے محض اندرونی خیالات وجذبات کو مؤثر اور حسن بیان کے ذریعہ دوسروں کے سامنے پیش کردینے کا، خواہ اس کا اثر قلب اور معاشرہ پر اچھا یا خراب کچھ بھی پڑے۔

ادب کے اسی مقصد اور غرض وغایت کو بروئے کار لانے اور اس کے راستہ کی تعیین و وضاحت کے لیے حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ نے اس رابطہ کی بنیاد ڈالی تھی، کیونکہ ادب ایک دودھاری تلوار ہے، اس سے خیر کا بھی کام لیا جاسکتا ہے اور شر کا بھی۔ یہ انسانی اخلاق وکردار کی تعمیر کا بہترین وسیلہ ہے اور لوگوں کو انسانی اخلاق کی بیخ کنی کی ڈگر سے ہٹا کر تعمیر وتشکیل اور اصلاح و درستگی کی شاہراہ پر ڈالنے کا ایک مؤثر ذریعہ بھی۔ قوت گویائی اور اپنے مافی الضمیر کی ادائیگی کی صلاحیت وطاقت اللہ کی ایک عظیم نعمت ہے، جس کو اللہ تعالیٰ نے مدح کے طور پر ذکر فرمایا ہے: ﴿ خلق الإنسان ، علّمه البيان﴾ (سورۂ رحمٰن: ۳-۴) اور حدیث میں اس کی اثر انگیزی اور خوبی کی بنا پر اسے جادو سے تعبیر کیا گیا ہے: ﴿ و إن من البيان لسحراً ﴾ اور اگر ہم موجودہ ماحول اور اس میں در آنے والی

خرابیوں، بگاڑ اور اخلاقی انارکی کا جائزہ لیں تو صاف معلوم ہوگا کہ اس قدر پستی، بگاڑ اور انتہائی خرابی کا اولین ذمہ دار یہی ادبی صلاحیت کا غلط استعمال ہے، اس لیے اس بات کی سخت ضرورت ہے کہ ادبی صلاحیت اور طاقت کو جس کے دائرۂ کار اور اثر انگیزی کو موجودہ ذرائع ابلاغ نے بہت وسیع کر دیا ہے، اس کے فطری رخ کی طرف واپس لایا جائے اور اس سے انسانی زندگی کی تعمیر و تشکیل اور اس کی عزت و حرمت بحال کرنے کا کام لیا جائے۔

مذکورہ بالا اغراض و مقاصد کو بروئے کار لانے کے لیے اس رابطہ کا قیام جنوری ۱۹۸۶ء میں عمل میں آیا۔

عالمی رابطہ ادب اسلامی کی خشت اول مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ نے رکھی ہے، اور وہی اس کے اولین صدر تھے، بلکہ درحقیقت وہ اسلامی ادب کی فکر کے مؤسس تھے اور یہ پودا ان ہی کا لگایا ہوا ہے۔ چنانچہ انہی کی دعوت پر ۱۴۰۱ھ (۱۹۸۱ء) میں ندوۃ العلماء میں ادب کا پہلا سیمینار منعقد ہوا، جس میں عالم عربی کے مختلف گوشوں سے تعلق رکھنے والے چیدہ اور چنندہ ادباء و شعراء شریک ہوئے، اور اسی کے نتیجہ میں ادب اسلامی کی اس عالمی انجمن کی تشکیل ہوئی، پھر اس فکر نے ترقی کی اور عرب ادباء نے بھی اس کا استقبال کیا، ان سب کا تذکرہ حضرت مولاناؒ نے اپنی خودنوشت سوانح حیات ''کاروان زندگی'' میں کیا ہے، چنانچہ لکھتے ہیں:

> ''مجھے اپنی تدریسی و تعلیمی مشغولیت کے زمانہ میں بھی اور اپنے تحریری و تصنیفی دائرہ کے اندر بھی، ہمیشہ اس حقیقت کا ادراک رہا کہ ادب اپنے اندر عظیم تعمیری و تخریبی طاقت رکھتا ہے، اس سے ایک طرف عقائد صحیحہ کی استواری، اور صحت مند اور صالح رجحانات کی آبیاری کا کام لیا جا سکتا ہے، تو دوسری طرف اخلاقی انسانی قدروں پر تیشہ زنی اور ذہنی و معاشرتی انتشار کا بھی، اور ہر دور میں اس کی روشن اور ناقابل انکار شہادتیں ملتی ہیں، لیکن اس دور میں ادب کی (اپنے وسیع معنی میں) جدید طاقتور وسائل کے پیدا ہو جانے کی وجہ سے جہانگیری اور فرمانروائی بہت بڑھ گئی ہے، عرصہ سے یہ

دیکھا جارہا ہے کہ جس طرح کبھی فلسفہ کے راستہ سے الحاد اور تشکیک کا سیلاب مسلمانوں کے علمی وفکری طبقہ میں آتا تھا، اس کے بعد سائنس (خاص طور پر علوم طبیعیہ) کے راستہ سے تعلیم یافتہ طبقہ میں آنے لگا اور کہیں کہیں نفسیات (سائکالوجی) اجتماعیات (سوشیالوجی) اور اقتصادیات و سیاسیات کے راستہ سے آتا تھا، اب بہت سی جامعات اور دانشگاہوں میں ادب کے ذریعہ سے آرہا ہے۔

خاص طور پر یہ بات فکر و دعوت اسلامی کے حاملین کے لیے تشویش کا باعث تھی کہ بلاد عربیہ بالخصوص مصر میں تقریباً نصف صدی سے ادب وتنقید اور نوجوانوں کو ذہنی وادبی غذا پہونچانے کے میدان پر اُن ادباء اور اہل قلم کی اجارہ داری قائم ہوگئی تھی، جن کے عقائد میں خود تزلزل، ذہن میں انتشار اور تحریروں میں تشکیکی رجحان پایا جاتا تھا، اس لیے ایک طرف اس کی ضرورت تھی کہ عربی ادب کے خزانۂ عامرہ سے وہ طاقتور اور دل آویز ادبی و تحریری نمونے نکالے جائیں اور ان کو نمایاں کیا جائے، جن کو سہولت پسندی اور قدیم مؤرخین ادب کی پیروی میں نظر انداز کردیا گیا، یا اس قصور میں کہ وہ کسی عالم وداعی اور دینی شخصیت کے قلم سے نکلے ہیں، ان کو "ایوان ادب" سے دور کردینے یا الگ رکھنے کی سزا دی گئی اور صدیوں ان پر پردہ پڑا رہا۔ دوسری ضرورت اس کی تھی کہ ادب عربی کے ایسے اساتذہ، اہل قلم اور دانشوروں کو جمع کیا جائے جو عربی ادب وانشاء اور تنقید وتاریخ ادب کو صحیح رخ پر لگانے کی کوشش کریں، اور جدید نسل کو صالح غذا پہونچانے کے لیے ایک نیا ذخیرۂ کتب (مکتبہ) اور ایک نیا مدرسۂ فکر (مکتب خیال) پیدا کرسکیں۔

پہلے جزء کے سلسلہ میں اس مضمون کے ذریعہ اس کام کی دعوت دی گئی جو دمشق کی رائل اکیڈمی المجمع العلمي العربي (حال مجمع اللغة العربية) کی رکنیت کے موقع پر ۱۹۵۷ء میں اس کے رسالہ کے لیے لکھا

گیا تھا، جو "المجمع" میں شائع ہوا، اور اب وہ" مختارات من أدب العرب" کا مستقل مقدمہ ہے۔ بعض بلند پایہ اساتذۂ ادب نے اس کا اعتراف کیا کہ ان کے لیے یہ مضمون فکر انگیز ثابت ہوا اور اس سے ان کے اندر ادب اسلامی کی تحریک پیدا ہوئی۔ دوسرے مقصد کی ضرورت کے لیے دار العلوم ندوۃ العلماء میں ۱۷-۱۹/اپریل ۱۹۸۱ء میں ایک بین الاقوامی سیمینار کیا گیا جس کا موضوع ''عربی ادب میں خصوصاً اور دوسری زبانوں کی ادبیات میں عموماً اسلامی عناصر کی تلاش'' تھا، توقع اور قیاس سے بڑھ کر ممالک عربیہ میں اس دعوت و تحریک کا استقبال ہوا اور اس کو Response ملا، اس میں حصہ لینے کے لیے متعدد عرب ممالک کے ممتاز فضلاء و ادباء لکھنؤ آئے، جن میں دور حاضر کے متعدد بلند پایہ مصنفین، فیکلٹی آف آرٹس کے ڈین اور شعراء و ادباء شامل تھے''۔

(کاروان زندگی: ۲/۳۲۸-۳۳۰)

اس سیمینار میں حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ نے جو اختتامی تقریر کی، اس میں اس سیمینار کے بنیادی مقصد اور ضرورت پر روشنی ڈالی، اور اس سلسلہ میں ہندوستان میں جو کام ہوا ہے، اس کا جائزہ پیش کیا، یہاں اس کا صرف ایک اقتباس پیش کیا جاتا ہے جس میں مولانا رحمۃ اللہ علیہ نے ادب کا بھرپور انداز میں تعارف کرایا ہے:

'' ادب ادب ہے خواہ وہ کسی مذہبی انسان کی زبان سے نکلے، کسی پیغمبر کی زبان سے ادا ہو، کسی آسمانی صحیفہ میں ہو، اس کی شرط یہ ہے کہ بات اس انداز سے کہی جائے کہ دل پر اثر ہو، کہنے والا مطمئن ہو کہ میں نے بات اچھی طرح کہہ دی، سننے والا اس سے لطف اٹھائے اور اس کو قبول کرے۔ میں نے کل عربی سیمینار میں کہا تھا کہ حسن پسندی تو یہ ہے کہ حسن جس شکل میں ہو، اسے پسند کیا جائے۔ بلبل کو آپ پابند نہیں کر سکتے کہ اِس پھول پر بیٹھے، اُس پھول پر نہ بیٹھے، لیکن یہ کہاں کا حسن مذاق ہے اور یہ کہاں کی حق

پسندی ہے کہ اگر گلاب کا پھول کسی میخانے کے صحن میں اس کے زیر سایہ کھلے تو وہ گلاب ہے، اور اس سے لطف اٹھایا جائے اور اگر کسی مسجد کے چمن میں کھل جائے تو پھر اس میں کوئی حسن نہیں، کیا یہ جرم ہے کہ اس نے اپنے نمو اور اپنی جلوہ نمائی کے لیے مسجد کا سہارا لیا؟۔ اقبال کا شعر تو ان کے سامنے نہیں پڑھ سکا تھا، مگر آپ کے سامنے پڑھ سکتا ہوں۔

حسن بے پروا کو اپنی بے نقابی کے لیے
ہوں اگر شہروں سے بن پیارے تو شہر اچھے کہ بن

ہمیں حسن بے پروا سے مطلب ہے کہ شہر و صحرا سے؟ تو ادب کے ساتھ معاملہ یہی کیا گیا۔'' (کاروان زندگی: ۲/۳۳۱-۳۳۲)

اسی مجلس مذاکرہ کا اثر تھا کہ اس کے بعض اہم ارکان و شرکاء نے (جن میں اکثر جامعة الإمام محمد بن سعود، ریاض، سعودی عرب کے موقر اساتذہ تھے) رابطة الأدب الإسلامي کے نام سے ریاض میں ایک عالمی تنظیم قائم کی اور مئی ۱۹۸۴ء کی کسی تاریخ کو ان کا ایک وفد حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ سے مکہ معظمہ میں ملا اور ان سے اس کی صدارت قبول کرنے کی خواہش کی۔ چنانچہ حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ اس کی تفصیل بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''مدینہ طیبہ سے ۷ رمئی (۱۹۸۴ء) کو جدہ واپسی ہوئی، مکۂ مکرمہ جا کر عمرہ کیا۔ وہاں عربی ادب کے ممتاز علماء کا ایک وفد آ کر ملا، یہ وفد ریاض کی امام محمد بن سعود یونیورسٹی اور مدینہ یونیورسٹی کے اساتذہ ڈاکٹر عبد الباسط بدر، استاد حیدر غدیر اور ڈاکٹر عبد القدوس ابو صالح پر مشتمل تھا، یہ حضرات ریاض اور مدینہ منورہ سے خاص غرض سے مکہ مکرمہ آئے تھے، انہوں نے رابطہ ادب اسلامی کے اغراض و مقاصد بیان کیے اور اس کے آئین کا مسودہ پیش کیا اور مجھ سے اس کی سربراہی قبول کرنے اور اس رابطہ کو ایک بین الاقوامی تنظیم کی حیثیت سے قائم کرنے کی اجازت دینے کی خواہش کی۔''

مولانا مزید تفصیل بتاتے ہوئے لکھتے ہیں:

''رابطہ کے قیام کے اصل محرک وداعی امام محمد بن سعود یونیورسٹی کے شعبۂ ادب کے صدر ڈاکٹر عبدالرحمٰن رافت الباشا تھے، جنہوں نے ادباء کی ایک مجلس میں پہلی ملاقات کے موقع پر کئی سال پہلے ریاض میں مجھ سے یہ کہا تھا کہ ادب اسلامی کے نقطۂ نظر سے اور ادب عربی میں اسلامی عناصر کو تلاش اور اجاگر کرنے کے لیے ادب عربی اور عربی زبان کے اسلامی کتب خانہ کو دوبارہ کھنگالنے اور اس کا از سرنو جائزہ لینے کا خیال سب سے پہلے آپ کی کتاب ''مختارات'' کے مقدمہ اور اس مضمون سے پیدا ہوا جو آپ نے المجمع العلمي العربي دمشق کا رکن منتخب ہونے پر ۱۹۵۷ء میں لکھا تھا، اور وہ " المجمع " کے سہ ماہی رسالہ میں شائع ہوا تھا۔ ڈاکٹر باشا نے خود سالہا سال سے اسی لائن پر کام شروع کر رکھا تھا اور کئی مجموعے مرتب کر کے شائع کر چکے تھے، اسی نقطۂ نظر سے وہ اپنے طلبہ کو ڈاکٹریٹ کے مقالوں کی تیاری کے لیے مشورہ دیتے تھے۔ اس طرح بالواسطہ یا بلاواسطہ ادب اسلامی کا ایک ذخیرہ منظر عام پر آ گیا''۔ (کاروان زندگی: ۳/۲۷-۲۸)

غرض مختلف مراحل سے گذرتے ہوئے جنوری ۱۹۸۶ء میں رابطہ ادب اسلامی کا جلسہ عام ندوۃ العلماء میں منعقد ہوا جس میں رابطہ کے دستور کو منظوری دی گئی اور اس طرح رابطہ ادب اسلامی کا قیام عمل میں آیا۔ اس کی مجلس امناء کا پہلا جلسہ استنبول ترکی میں جون ۱۹۸۶ء میں منعقد ہوا، پھر مجلس امناء کے جلسے مدینہ منورہ، قاہرہ، عمان اردن، فاس مراکش اور استنبول وغیرہ میں منعقد ہوتے رہے۔

رابطہ ادب اسلامی کی باقاعدہ تشکیل کے بعد حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ رابطہ کے تاحیات صدر منتخب کیے گئے اور اس کے دو دفتر قرار پائے، ایک شعبۂ برصغیر و ممالک مشرقیہ کے لیے اور دوسرا عالم عربی اور مغربی ممالک کے لیے، مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی (اس وقت کے صدر شعبۂ عربی دارالعلوم ندوۃ العلماء اور موجودہ ناظم ندوۃ العلماء،

لکھنؤ) شعبہ برصغیر ومما لک مشرقیہ کے سکریٹری جنرل منتخب ہوئے اور ڈاکٹر عبدالرحمٰن رافت الباشا عربی اور مغربی مما لک کے سکریٹری جنرل ہوئے اور رابطہ کا صدر دفتر ندوۃ العلماء میں قرار پایا اور حضرت مولانا کی زندگی بھر یہ مرکزی دفتر اپنی خدمات انجام دیتا رہا، پھر حضرت مولانا کے انتقال کے بعد جب ڈاکٹر عبدالقدوس ابوصالح عالمی سطح کے صدر ہوئے تو مرکزی دفتر ریاض منتقل ہوگیا، ان کی جگہ مما لک عربیہ ومغربیہ کے نائب صدر ڈاکٹر عبدالباسط بدر ہوئے اور مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی صاحب عالمی سطح کے نائب صدر اور برصغیر اور مما لک مشرقیہ کے صدر ہوئے، ڈاکٹر حسن امرانی رابطہ کے سکریٹری جنرل ہوئے اور راقم سطور کو ان کا نائب اور برصغیر اور مما لک مشرقیہ کا سکریٹری جنرل بنایا گیا۔

ادب اسلامی کے اس خیال اور تحریک کو عمومی مقبولیت حاصل ہوئی، چنانچہ دونوں دفاتر کے ان کے تابع ملکوں میں بہت سی فروع قائم ہوئیں جیسے ہندوستان، بنگلہ دیش، پاکستان، سعودی عرب، اردن، ترکی، مراکش اور الجزائر وغیرہ۔

ان تمام ملکوں کے مختلف شہروں میں کئی سیمینار منعقد ہوئے، جن کا سلسلہ تا حال جاری ہے۔ نیز رابطہ ادب اسلامی کے مسائل پر غور وفکر کے لیے ہر سال مجلس امناء کا جلسہ ہوتا ہے، اور ہر تین سال پر سارے اراکین کا ایک عمومی اجلاس ہوتا ہے۔

عالمی رابطہ ادب اسلامی نے ادب کے مختلف موضوعات واصناف خصوصاً نقد ادب، تاریخ ادب، قصہ، ڈراما اور ادب اطفال پر عظیم اور بیش قیمت لٹریچر تیار کر دیا ہے، اور مصر، ترکی، پاکستان، سعودی عرب اور ہندوستان سے اس کے ترجمان کے طور پر ادب اسلامی کے مجلّات نکلتے ہیں، ہندوستان کے صدر دفتر لکھنؤ سے سہ ماہی مجلّہ ''کاروان ادب'' نکلتا ہے۔

ہندوستان میں رابطہ ادب اسلامی کی شاخیں اور فروع دہلی، حیدر آباد، بھوپال، اورنگ آباد، ممبئی، جمبوسر گجرات، پونہ، بھٹکل، کیرالا، بنگلور، کلکتہ، پٹنہ، رانچی اور غازیپور وغیرہ میں ہیں اور ادب اسلامی کے تعلق سے اپنی سرگرمیاں جاری رکھے ہوئے ہیں۔ ہندوستانی دفتر کے تحت اب تک مختلف موضوعات پر ۳۶ سیمینار منعقد ہو چکے ہیں، ان کے علاوہ ہندوستان کی مختلف شاخوں کے تحت بھی متعدد علاقائی سیمینار اور ماہانہ نشستیں ہوئیں

اور ہوتی رہتی ہیں۔اب تک جن موضوعات پر سیمینار ہوئے ہیں، وہ مندرجہ ذیل ہیں:۔

۱- ادبیات اسلامی	لکھنؤ	۱۹۸۶ء
۲- اسلامی ادب اور مغربی ادبی تحریکات	جیپور	۱۹۸۷ء
۳- حضرت سید احمد شہیدؒ کی تحریک کے اثرات اردو زبان وادب پر	لکھنؤ	۱۹۸۷ء
۴- نعتیہ شاعری: تاریخی وعلمی جائزہ وخصوصیات	اورنگ آباد	۱۹۸۸ء
۵- تحریک آزادی واصلاح عوام میں ادب اسلامی کا حصہ	حیدرآباد	۱۹۸۹ء
۶- حمد ومناجات ودعاء	رائے بریلی	۱۹۹۰ء
۷- دعوتی واصلاحی ادب	بھوپال	۱۹۹۱ء
۸- خطوط اور تأثراتی خاکوں کا ادب	لکھنؤ	۱۹۹۲ء
۹- مشرقی اقوام کے زبان وادب میں اسلامی رجحانات	بنگلہ دیش	۱۹۹۴ء
۱۰- حدیث شریف کی ادبی وفنی خصوصیات	بنارس	۱۹۹۴ء
۱۱- ادب میں سفرناموں کی اہمیت	اورنگ آباد	۱۹۹۵ء
۱۲- سوانحی ادب وتذکرہ نویسی	اعظم گڑھ	۱۹۹۵ء
۱۳- ملفوظات ومواعظ ادب کے آئینہ میں	حیدرآباد	۱۹۹۶ء
۱۴- اسلامی نشأۃ ثانیہ میں ادب کا حصہ	پٹنہ	۱۹۹۷ء
۱۵- تاریخ نویسی کا جائزہ ادب کے تناظر میں	پونہ	۱۹۹۸ء
۱۶- اسلامی ادب میں قصہ نگاری	بنگلور	۱۹۹۹ء
۱۷- بچوں کا ادب	بھٹکل	۲۰۰۰ء
۱۸- اسلامی ادب کی نمائندہ شخصیات	لکھنؤ	۲۰۰۲ء
۱۹- انسانی کردار سازی میں اخلاقی واسلامی ادب کی خدمات	بھوپال	۲۰۰۳ء
۲۰- اردو شاعری میں ملی احساسات کی ترجمانی	رائے بریلی	۲۰۰۳ء
۲۱- تراجم قرآن کا جائزہ: زبان وادب اور فکر کی ترجمانی	اجراڑہ، میرٹھ	۲۰۰۴ء
۲۲- اردو زبان وادب کی تشکیل میں ہندوستان کے مختلف علاقوں کا حصہ	کلکتہ	۲۰۰۵ء
۲۳- اردو زبان وادب کے ارتقاء میں علماء کی خدمات	غازیپور	۲۰۰۵ء
۲۴- حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی کی تحریروں کا ادبی جائزہ		

(خطوط وخطبات کے حوالے سے) ممبئی ۲۰۰۷ء

۲۵- اردو ادب وشاعری پر عربی زبان کے اثرات رائے بریلی ۲۰۰۷ء

۲۶- قرآن کریم کا اعجاز بیانی کنور (کیرالہ) ۲۰۰۸ء

۲۷- مختلف زبانوں میں کتب سیرت کا ادبی جائزہ اورنگ آباد ۲۰۰۹ء

۲۸- علامہ محمد طاہر پٹنی و دیگر علماء گجرات اوران کی ادبی وعلمی خدمات۔ جمبوسر ۲۰۱۰ء

۲۹۔ اسلامی ادب میں ذرائع ابلاغ کی اہمیت اوراس کے اسلامی اصول واقدار، بھٹکل کرناٹک ۲۰۱۱ء

۳۰۔ ادب نبوی کا تربیتی پہلو مانک مئوسہارنپور ۲۰۱۲ء

۳۱۔ برصغیر و بلاد عربیہ کے معاصر شعراء کی شاعری کا تقابلی مطالعہ، کلکتہ ۲۰۱۲ء

۳۲۔ بیسویں صدی میں اردو کا سوانحی ادب اور تعمیری قدریں، علی گڈھ ۲۰۱۳ء

۳۳۔ علامہ شبلی اوران کے معاصر شعراء کے کلام میں ملت اسلامیہ کے مسائل وقضایا، اورنگ آباد ۲۰۱۳ء

۳۴۔ انسانیت کی خدمت میں مختلف اصناف ادب کا حصہ، چنئی ۲۰۱۵ء

۳۵۔ قرآن مجید کے کلام میں ہدایتی اسلوب وحسن تعبیر و بلاغت کا امتزاج، اکل کوا ۲۰۱۵ء

۳۶۔ اردو زبان وادب کے ارتقاء میں دکن کا حصہ حیدرآباد ۲۰۱۶ء

قرآن کریم کا اعجاز و اسلوبِ بیان

قرآن مجید کا اعجاز لامحدود ہے

قرآن کریم صحف سماویہ میں اپنی خصوصیات کے اعتبار سے منفرد کتاب الٰہی ہے، اس کی سب سے بڑی خصوصیت اس کا تحریف سے محفوظ رہنا ہے، وہ صوتی، لفظی اور ترتیب کے اعتبار سے محفوظ ہے، خود قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے جو اس خاص امتیاز کی طرف اشارہ کرتا ہے ﴿إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَإِنَّا لَهُ لَحَافِظُونَ﴾ [سورہ حجر:۹] (بیشک ہم نے ہی قرآن نازل کیا اور ہم ہی اس کی حفاظت کرنے والے ہیں) اس سے معلوم ہوا کہ یہ کتاب قیامت تک اپنی خصوصیات کے ساتھ محفوظ اور قابل استفادہ رہے گی۔

قرآن کی امتیازی صفات

مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتاب ''مطالعہ قرآن کے اصول ومبادیٔ'' (ص:۲۷) میں تحریر فرمایا ہے:

> ''قرآن ''فرقان'' (فاروق اور ممیّز) ہے اور یہ اس کی ایسی امتیازی صفت ہے جو اس کے نام کے قائم مقام ہوگئی ہے ﴿تَبَارَكَ الَّذِي نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلَى عَبْدِهِ لِيَكُونَ لِلْعَالَمِينَ نَذِيرًا﴾ [سورہ فرقان:۱] (بڑی عالیشان ذات والا ہے جس نے یہ فیصلہ کی کتاب اپنے بندۂ خاص پر نازل فرمائی، تاکہ وہ تمام دنیا پر جہاں والوں کے لئے ڈرانے والا ہو) قرآن مجید نے ہدایت وگمراہی میں، ایمان وکفر میں، اسلام اور جاہلیت میں، خدا کی رضا وعدم رضا میں، یقین وظن میں، حلال وحرام میں، قیامت تک کے لئے جو فصل اور امتیاز پیدا کردیا ہے اس کی نظیر سے مذہبی تعلیمات اور آسمانی صحیفوں کی تاریخ خالی ہے''۔

قرآن کریم اپنی زبان وبیان اور مضامین کے اعتبار سے ہر زمانہ میں بحث وتحقیق کا

موضوع رہا ہے، اس لئے کہ وہ عربی میں نازل ہونے کے باوجود ہر دور اور ہر قوم کو یکساں طور پر مخاطب کرتا ہے، ارشاد باری تعالی ہے

﴿لَقَدْ أَنزَلْنَا إِلَيْكُمْ كِتَاباً فِيهِ ذِكْرُكُمْ أَفَلَا تَعْقِلُونَ﴾[سورہ انبیاء:۱۰]

ہم نے تمہاری طرف ایسی کتاب نازل کی ہے جس میں تمہارا تذکرہ ہے کیا تم نہیں سمجھتے، دوسری جگہ ارشاد ہے۔

﴿وَلَقَدْ جِئْنَاهُم بِكِتَابٍ فَصَّلْنَاهُ عَلَى عِلْمٍ هُدًى وَرَحْمَةً لِّقَوْمٍ يُؤْمِنُونَ﴾[سورہ اعراف:۵۲]

اور ہم نے ان کے پاس کتاب پہنچادی ہے، جس کو علم ودانش کے ساتھ کھول کھول کر بیان کر دیا ہے، اور مؤمن لوگوں کے لئے ہدایت ورحمت ہے۔

ایک دوسری خصوصیت کی طرف اشارہ اس طرح کیا گیا ہے۔

﴿الر تِلْكَ آيَاتُ الْكِتَابِ الْمُبِينِ إِنَّا أَنزَلْنَاهُ قُرْآناً عَرَبِيّاً لَّعَلَّكُمْ تَعْقِلُونَ﴾ [سورہ یوسف:۱-۲]

یہ کتاب روشن کی آیتیں ہیں، ہم نے اس قرآن کو عربی میں نازل کیا، تاکہ تم سمجھ سکو۔

قرآن کتاب ہدایت، بشارت اور رحمت ہے اور ہر چیز کی تفصیل بیان کرنے والی کتاب ہے۔

﴿إِنَّ هَـذَا الْقُرْآنَ يِهْدِي لِلَّتِي هِيَ أَقْوَمُ﴾(اسراء: ۹)

قرآن سیدھے راستہ کی طرف رہنمائی کرتا ہے۔

﴿وَنَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْكِتَابَ تِبْيَاناً لِّكُلِّ شَيْءٍ وَهُدًى وَرَحْمَةً وَبُشْرَى لِلْمُسْلِمِينَ﴾(نحل:۸۹)

اور ہم نے آپ پر کتاب اتاری جس میں ہر چیز کی تفصیل ہے، اور مسلمانوں کے لیے کتاب ہدایت ورحمت اور بشارت ہے۔

قرآن کا اعجاز

عربوں کو چونکہ فصاحت وبلاغت کا دعوی تھا اور یہ ان کا امتیاز تھا، وہ دوسری قوموں کو

عجمی سمجھتے تھے اور وہ قرآن کریم کے مخاطب اول تھے، اس لئے قرآن کریم نے ان کو اس بنیاد پر چیلنج کیا کہ وہ اس سے بہتر نمونہ لاکر دکھائیں، وہ اس میں ناکام رہے، بلکہ ان کے اہل علم وذوق نے اس کے معجز ہونے کا اقرار کیا، ولید بن مغیرہ جو حضور ﷺ کے دشمن تھے آپؐ کو قرآن کریم کی بعض آیتیں تلاوت کرتے ہوئے سنیں تو اتنا متاثر ہوئے کہ وہ بھاگے ہوئے قریش کے بعض سرداروں کے پاس آئے اور کہا کہ:۔

والله لقد سمعت من محمد كلاماً ما هو من كلام الإنس، ولا من كلام الجن، وإن له لحلاوة، وإن عليه لطلاوة، وإن أعلاه لمثمر، وإن أسفله لمغدق۔

(خدا کی قسم میں نے محمد (ﷺ) کو ایسا کلام پڑھتے سنا ہے کہ جو نہ تو انسانوں کا کلام ہوسکتا ہے اور نہ جنات کا، اس میں تو بڑی مٹھاس اور بڑا بانکپن اور دلکشی ہے، اس کا اوپری حصہ (یعنی ظاہری الفاظ) بڑا پھلدار (بڑا سامعہ نواز اور حسین) اور اس کا نچلا حصہ بہت زیادہ پانی والا ہے (یعنی معانی اور مطالب کے لحاظ سے بہت دقیق اور گہرا ہے)۔

اس اعتبار سے قرآن کریم کا بنیادی اعجاز اعجاز بیانی قرار پایا۔

قرآن کریم اعجاز بیانی کے ساتھ رشد وہدایت، علم وفکر، اخبار بالغیب، امم سابقہ کا تذکرہ، غلط تصورات اور معتقدات کی تصحیح، تخلیق انسان اور کائنات کے اسرار اور خدا کی مخلوقات کی خصوصیات، طبیعت انسانی کے رجحانات، اور صلاحیتوں، اعمال انسانی کے نتائج اور اثرات، اور اس طرح کے انسان کی زندگی کے مختلف شعبوں کے بارے میں رہنمائی کرنے والی کتاب ہے۔

اعجاز بیانی

ان مختلف اور متعدد خصوصیات کی وجہ سے قرآن کریم پر ہر دور میں اہل علم نے اپنے اپنے زاویوں سے کام کیا، ابتدائی دور بیان کا تھا، اس لئے کہ عربوں کا یہ امتیاز تھا، اس لئے قرآن کریم کے اعجاز بیانی پر زیادہ کام ہوا، اور اس موضوع پر ایک کتب خانہ تیار ہوگیا، اور اس کا سلسلہ اس عہد تک جاری ہے، اس سلسلہ میں ابن قتیبہ کی کتاب "تأويل مشكل القرآن" ابو

الحسن اشعری کی کتاب ''مقالات الإسلامیین''ابوالحسن خیاط کی کتاب ''الانتصار''، ابوعبیدہ کی کتاب ''مجاز القرآن''، فراء کی کتاب ''معانی القرآن''، جاحظ کی کتاب ''نظم القرآن''، ابوبکر عبداللہ سجستانی (متوفی ۳۱۶ھ) کی کتاب ''نظم القرآن''، ابوعبداللہ محمد بن زید واسطی معتزلی (متوفی ۳۰۶ھ) کی کتاب ''اعجاز القرآن''، ابوبکر باقلانی (متوفی ۳۰۴ھ) کی کتاب ''اعجاز القرآن''، ابن عربی کی ''اعجاز القرآن''، ابوالحسن علی بن عیسیٰ رمانی (۳۸۴ھ) کی کتاب ''النکت في اعجاز القرآن''، ابوسلیمان حمد بن محمد خطابی کی کتاب ''بیان اعجاز القرآن''، قاضی ابوالحسن عبدالجبار معتزلی کی کتاب ''اعجاز القرآن''، عبدالقادر جرجانی کی کتاب ''دلائل الإعجاز'' اور ''أسرار البلاغة''، فخر الدین رازی کی کتاب ''نهاية الإيجاز في دراية الإعجاز'' ابن ابی اصبع مصری کی کتاب ''بدیع القرآن''، یحی بن حمزہ علوی کی کتاب ''الطراز في أسرار البلاغة وعلوم حقائق الإعجاز'' برہان الدین بن عمر بقاعی (متوفی ۸۸۵ھ) کی کتاب ''نظم الدرر''، جلال الدین سیوطی کی کتاب ''الاتقان في علوم القرآن''، اور کتب تفاسیر میں جاراللہ زمخشری کی کتاب ''کشاف'' بیش قیمت سرمایہ ہے۔

زبان وادب کے ماہرین ابن قتیبہ، ابن سلام جمحی، ابوعبداللہ مبرد نے کتاب اللہ کی زبان وبیان پر کتابیں لکھیں، غریب القرآن، مشکلات القرآن، مجاز القرآن، نظام القرآن پر مستقل کتابیں لکھی گئیں، احکام القرآن پر بھی متعدد کتابیں تصنیف کی گئیں، سابقہ قوموں کے قصوں پر قصص القرآن کے نام سے متعدد کتابیں لکھی گئیں۔

تفسیر پر جو کتابیں لکھی گئیں، وہ صاحب تفسیر کے رجحان کے اعتبار سے ہیں اور ہر کتاب چاہے وہ متقدمین کی ہو، یا متاخرین کی، زمانہ اور صاحب کتاب کی اپنی فہم اور ذوق کے اعتبار سے ہے، اور ہر تفسیر اپنی ایک خصوصیت رکھتی ہے۔

إعراب القرآن پر متعدد کتابیں تصنیف کی گئیں، اس اعتبار سے قرآن کریم کا مطالعہ ایک مستقل موضوع ہر دور میں رہا ہے، اور علمی، ادبی اور دینی حیثیت سے اہل علم کو اس موضوع سے ہمیشہ دلچسپی رہی ہے، اس طرح عربی کے علاوہ مسلمانوں کی دوسری زبانوں

میں بھی قرآن کریم کے مختلف موضوعات اور خصوصیات کے اعتبار سے کتابیں تصنیف کی گئیں، فارسی اور اردو زبانوں کا عربی زبان کے بعد تیسرا حصہ رہا ہے۔

قرآن کریم کے ترجمے بھی اسی تنوع کے ساتھ ہر دور میں ہوئے اور اس کا سلسلہ اب تک جاری ہے، ہندوستان میں فارسی اور علاقائی زبانوں میں ترجمے کیے گئے، اس دور میں یورپ کی مختلف زبانوں میں ترجمے کیے جارہے ہیں۔

اعجاز علمی

یہ دور علمی ذوق کا ہے، اس میں بیان کو کم اہمیت دی جاتی ہے، اس لیے اس دور میں قرآن کریم کے اعجاز علمی پر متعدد اہل علم کے قلم سے کتابیں شائع ہوئیں، اور مقبول ہورہی ہیں، کسی نے قرآن مجید کے تشریعی اعجاز پر قلم اٹھایا، کسی نے کائنات کے بارے میں قرآن کریم کے معجزانہ اسلوب پر بحث کی ہے، جیسے علامہ رشید رضا کی کتاب ''الوحی المحمدی'' شیخ محمد ابوزہرہ کی کتاب'' شرعیة القرآن دلیل علی أنه من الله سبحانه وتعالی'' اور مالک بن نبی کی کتاب ''الظاهرة الكونية فی القرآن'' ہے اور یہ کتابیں ہدایت کا سبب بن رہی ہیں۔

لیکن اعجاز بیانی وہ اعجاز ہے جس کا قرآن کریم نے خود دعوی کیا ہے اور اس پر چیلنج کیا ہے، اس لئے اس کے ساتھ اعجاز بیانی پر بھی کام جاری ہے، مصطفیٰ صادق الرافعی کی کتاب ''اعجاز القرآن''، شیخ محمد عبداللہ دراز کی کتاب ''النبأ العظيم''، سید قطب شہید کی کتاب ''التصوير الفني في القرآن'' اور ''مشاهد القيامة في القرآن''، محمد الخناوی کی کتاب ''الفاصلة في القرآن'' اور ڈاکٹر عائشہ عبدالرحمٰن بنت الشاطی کی کتاب ''الإعجاز البياني للقرآن'' خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

بعض مصنفین نے قرآن کریم کی دونوں خصوصیات پر توجہ کی ہے اور انہوں نے قرآن کریم کے اسلوب بیان کی خصوصیات یہاں تک کہ صوتی آہنگ پر بھی روشنی ڈالی ہے، سید قطب شہید نے اس پہلو پر اپنی کتاب'' التصوير الفني في القرآن'' میں تفصیل سے روشنی ڈالی ہے، اس پہلو پر کم لوگوں نے توجہ کی ہے، کہ الفاظ اور معانی اور نظم کے علاوہ قرآن کریم کی آیات میں خاص طور سے بعض سورتوں میں صوتی اعجاز بھی پایا جاتا ہے، صرف اس کو سن کر

لوگ اس کے کلام الٰہی ہونے کے قائل ہوئے ہیں اور اس کی متعدد مثالیں ملتی ہیں۔

عرب جو براہ راست مخاطب تھے، وہ عربی زبان کی تعبیر و بیان کے مختلف وجوہ سے واقف تھے، اس لئے وہ قرآن کریم کی چند آیات سنتے ہی اس کے کلام الٰہی ہونے کا اقرار کر لیتے تھے، چاہے وہ کتنے ہی مخالف ہوں۔

اعجاز قرآن کا تنوع

مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی رحمۃ اللہ علیہ اپنی کتاب ''مطالعۂ قرآن کے اصول ومبادی'' (ص:۴۶-۵۴) میں لکھتے ہیں:۔

''قرآن مجید صرف اپنے الفاظ وترکیب اور فصاحت وبلاغت ہی کے اعتبار سے معجزہ نہیں ہے، بلکہ وہ اپنے الفاظ اور ترکیب میں بھی معجزہ ہے، اپنے معانی ومضامین میں بھی، اپنے اعلیٰ علوم ومعارف میں بھی، معلومات غیبی اور حقائق ابدی میں بھی، اپنی پیش کی ہوئی مذہبی واخلاقی ومعاشرتی اور مدنی تعلیمات میں بھی، اپنے اثرات وانقلابات میں بھی، اپنی پیشن گوئیوں اور اخبار میں بھی معجزہ ہے، مگر جب صرف الفاظ میں جو اس کے اعجاز کامل کا صرف ایک پہلو اور گوشہ ہے کوئی مقابلہ نہیں ہو سکا تو اس کے اعجاز کامل میں کیا مماثلت ہو سکتی ہے؟''۔

قرآن کریم کے کسی موضوع یا اس کے کسی علمی اور فنی پہلو پر روشنی ڈالنا یہ سعادت کی بات رہی ہے اور دعوت وارشاد کا ایک موثر طریقہ بھی ہے، اس لئے صرف قرآن کریم سے متاثر ہو کر عہد قدیم میں بکثرت لوگ مشرف باسلام ہوئے اور اس دور میں بھی اس کی مثالیں سامنے آ رہی ہیں۔

قرآن کریم کے علمی مواد سے یورپ کے دانشوروں کے متاثر ہونے کے واقعات اخبار میں شائع ہوتے رہتے ہیں، مگر اس کی فنی جاذبیت اور کشش سے بھی متاثر ہونے کے واقعات سامنے آ رہے ہیں۔

قرآن کریم میں قصہ نگاری

اور دینی وفنی مقاصد کا حسین امتزاج

اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ قصہ ادب میں اہم صنف ہے اور وہ بعض وقت شعر سے زیادہ تأثیر رکھتا ہے، شعر کا اثر وقتی ہوتا ہے، لیکن قصہ پوری زندگی پر اثر انداز ہوتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی حقیقت ہے کہ قصہ کا دور اور اس کا عمل شعر کے دور اور اس کے عمل سے پہلے شروع ہوجاتا ہے، اس کی ابتداء ماں کی گود سے ہوتی ہے، مائیں اپنے ذوق اور مزاج کے اعتبار سے قصوں کے ذریعہ بچوں کا دل بہلاتی ہیں، اور بعض وقت بعض قصے بچے کی ذہن کی تشکیل میں اہم رول ادا کرتے ہیں، بعض بڑی شخصیتوں کے تذکرہ میں ایسے قصوں کا تذکرہ ملتا ہے، جو انہوں نے بچپن میں سنے یا پڑھے، اور بعض قصے نفسیات اور فکر پر انداز ہوتے ہیں۔

قصہ کسی شکل میں ہو، ہر دور میں رہا ہے، قصوں سے انسان کا ربط نیا نہیں، انسان کی اس سے دلچسپی ازلی ہے، یہی وجہ ہے کہ اس فن کا آغاز مصوری، بت تراشی اور دیگر فنون لطیفہ سے پہلے ہوا۔

قصہ کی اہمیت اور تأثیر کے پیش نظر مصلحین اور معلمین ذہن سازی کے لیے اور تأثیر قلبی کے لیے قصوں کا سہارا لیتے ہیں، قرآن کریم میں اور حدیث شریف میں قصوں کا عظیم سرمایہ ہے۔ قرآن کریم میں ایک جگہ پر قصہ کی اہمیت اور افادیت بیان کی گئی ہے۔

﴿فَاقْصُصِ الْقَصَصَ لَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُونَ﴾ [اعراف: ۱۷۶]

سو آپ (یہ) حالات بیان کیجیے تاکہ لوگ سوچیں۔

﴿نَحْنُ نَقُصُّ عَلَيْكَ أَحْسَنَ الْقَصَصِ بِمَا أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ هَـٰذَا الْقُرْآنَ﴾ [یوسف:۳]

ہم نے جو یہ قرآن آپ کے پاس وحی سے بھیجا ہے تو ہم ہی اس کے ذریعہ آپ سے ایک بہترین قصہ بیان کرتے ہیں۔

اور سورہ یوسف کے اخیر میں قرآنی واقعات اور قصص کی معنویت اور مقصد کی وضاحت اس طرح کی گئی ہے۔

﴿لَقَدْ كَانَ فِي قَصَصِهِمْ عِبْرَةٌ لِّأُولِي الْأَلْبَابِ مَا كَانَ حَدِيثًا يُفْتَرَىٰ وَلَٰكِن تَصْدِيقَ الَّذِي بَيْنَ يَدَيْهِ وَتَفْصِيلَ كُلَّ شَيْءٍ وَهُدًى وَرَحْمَةً لِّقَوْمٍ يُؤْمِنُونَ﴾ [سورہ یوسف:۱۱۱]

اگلے لوگوں کے ان قصوں میں عقل وہوش رکھنے والوں کے لئے عبرت ہے یہ جو کچھ قرآن میں بیان کیا جارہا ہے، بناوٹی باتیں نہیں ہیں، بلکہ جو کتابیں اس سے پہلے آئی ہوئی ہیں انہی کی تصدیق کرتی ہے اور ہر چیز کی تفصیل اور ایمان لانے والوں کے لئے ہدایت اور رحمت ہے۔

قرآن میں قصہ بیان کرنے کا مقصد

قرآن مجید کا اسلوب بیان حسن تعبیر اور بلاغت کا اعلیٰ شاہکار ہے، اس لئے کہ اس کا مقصد محض قصہ بیان کرنا اور تفریح یا علم میں اضافہ نہیں ہے، بلکہ بنیادی مقصد موعظت ہے، جیسا کہ بیان کیا گیا ہے﴿لعلهم يتفكرون﴾ بعض جگہ اس کے لئے ''ذکری'' کی تعبیر استعمال کی گئی ہے، اس لئے اس کا انداز ضرورت اور سیاق کے اعتبار سے ہے اور اس میں تنوع پایا جاتا ہے، اور اس کے پیش کرنے کا طریقہ مختلف ہے، مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:۔

''قرآن کریم نے دعوت کے لئے واقعات بیان کرنے اور مثالیں دینے کا اسلوب اختیار کیا ہے، دوسرے وسائل دعوت کی بہ نسبت یہ طریقہ زیادہ زود اثر اور دلنشیں ہے اور مقصد کے حصول میں یہ طریقہ زیادہ مفید اور کارآمد ثابت ہوا ہے، ایک طرف قرآن کریم نے اگر تفصیلی ضابطے اور قانونی باریکیاں بتانے کو ضروری نہیں سمجھا ہے تو دوسری طرف اس خلا کو (اگر اس کو خلا سمجھا

جائے جو درحقیقت خلا نہیں ہے) انبیاء کرام کی سیرت اور ان کے مواعظ اور دعوت پر مکالموں کے نمونوں سے پر کیا ہے۔ یہ نمونے دلوں پر اثر اندازی کی بے انتہا قوت رکھتے ہیں، ذہن وقلب پر ان کا سحر کی مانند اثر ہوتا ہے، کیونکہ عملی نمونوں کا جو اثر ہوتا ہے، وہ کسی دوسرے وسائل دعوت کا نہیں ہوسکتا، منطقی، نفسیاتی، علم کلام کے انداز کے جدلی اصول، دعوت کے لئے کارآمد عناصر نہیں ثابت ہوئے ہیں، تمام آسمانی صحیفوں نے شروع سے آخر تک عملی نمونوں پر اعتماد کیا ہے، یہ نمونے اور مثالیں ادبی شہ پارے ہیں جو دلوں کو موہ لیتے ہیں۔

ان میں سے اکثر واقعات چار برگزیدہ پیغمبروں کی سیرتوں سے ماخوذ ہیں، وہ انبیاء کرام حضرت ابراہیم، دوسرے حضرت یوسف، تیسرے حضرت موسیٰ علیہم السلام اور آخر میں خاتم الانبیاء والرسل محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں''۔

(دعوت وتبلیغ کا معجزانہ اسلوب، ص:۲۴-۲۵)

قصہ نگاری کے مختلف اسالیب بیان

قرآن شریف میں زیادہ تر قصے انبیاء علیہم السلام کے پیش کئے گئے ہیں، مگر وہ مکمل قصہ جو ان کی زندگی کے اکثر حصہ پر مشتمل ہو، ایک جگہ نہیں بیان کیا گیا، بلکہ ان کی زندگی کے ادوار موضوع کی مناسبت سے متفرق مقامات پر بیان کئے گئے، صرف حضرت یوسف علیہ السلام کا قصہ سورہ یوسف میں مکمل آگیا ہے۔

مختلف سورتوں میں آنے والے قصوں کا اسلوب مختلف ہے، جیسے انعام میں انبیاء کا صرف تذکرہ (آیت: ۷۵-۹۱) ہے، سورہ اعراف میں کچھ تفصیل ہے، سورہ ہود میں مزید تفصیل بیان کی گئی ہے، اور سورہ کہف میں اصحاب کہف کا قصہ بیان کر کے حضرت موسیٰ کی زندگی کا ایک واقعہ بیان کیا گیا جو دوسری جگہ مذکور نہیں، اس کے بعد ذوالقرنین کا واقعہ جو صرف ایک مرتبہ ذکر کیا گیا، طہٰ، مریم، قمر اور دوسری سورتوں میں قصوں کا ابتدائی حصہ یعنی انبیاء کی دعوت اور قوم کا ردعمل بیان کیا گیا ہے جس میں یہ بتانا مقصود ہے کہ سارے انبیاء کی دعوت ایک

خدا کی عبادت اور اچھے اخلاق اختیار کرنے کی دعوت ہے اور اس قوم کی متعین کمزوری یا معصیت کے ازالے کی تلقین، دوسری سورتوں میں انبیاء کی دعوت کے انکار اور ان انبیاء کے ساتھ معاندانہ سلوک اور ان سے عذاب لانے کے مطالبہ کا ذکر آیا ہے، اور بعض سورتوں میں اختصار کے ساتھ انبیاء کی دعوت، قوم کا دعوت سے انکار اور عذاب کے نزول کا ذکر ایک ساتھ آیا ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے قصہ کے مختلف اجزاء مختلف مقامات پر بیان کیے گئے ہیں۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کا قصہ قرآن کریم میں تقریباً ۳۱ر جگہوں پر آیا ہے اور وہ مکرر نہیں ہے، بلکہ مختلف واقعات مختلف مقامات پر سیاق کے اعتبار سے آئے ہیں۔

حضرت آدم علیہ السلام کی تخلیق اور ابلیس کا ردعمل صرف اختصار کے ساتھ قرآن شریف میں مختلف مقامات پر آیا ہے، اصحاب کہف کا واقعہ صرف سورہ کہف میں بیان کیا گیا ہے۔

سورہ کہف میں منظر کشی

قرآنی قصوں کی ایک خصوصیت منظر کشی اور انسانی نفسیات اور احساس کی تصویر کشی ہے۔ مثلاً سورہ کہف میں جائے وقوع کی تصویر کشی۔

﴿وَتَرَى الشَّمْسَ إِذَا طَلَعَت تَّزَاوَرُ عَن كَهْفِهِمْ ذَاتَ الْيَمِينِ وَإِذَا غَرَبَت تَّقْرِضُهُمْ ذَاتَ الشِّمَالِ وَهُمْ فِي فَجْوَةٍ مِّنْهُ﴾ [سورہ کہف: ۱۷]۔

اور آپ دیکھیں گے کہ سورج جب طلوع ہوتا تو ان کے غار کے دائیں جانب سے ہو کر گزر جاتا اور جب غروب ہوتا تو ان سے کترا کر بائیں طرف نکل جاتا اور وہ اس کی ایک کھلی جگہ میں تھے۔

اصحاب کہف کے بارے میں ارشاد ہے۔

﴿وَتَحْسَبُهُمْ أَيْقَاظاً وَهُمْ رُقُودٌ وَنُقَلِّبُهُمْ ذَاتَ الْيَمِينِ وَذَاتَ الشِّمَالِ وَكَلْبُهُم بَاسِطٌ ذِرَاعَيْهِ بِالْوَصِيدِ لَوِ اطَّلَعْتَ عَلَيْهِمْ لَوَلَّيْتَ مِنْهُمْ فِرَاراً وَلَمُلِئْتَ مِنْهُمْ رُعْبا﴾ [سورہ کہف: ۱۸]

اور آپ (ان کو دیکھتے تو) ان کو جاگتا سمجھتے جبکہ وہ سو رہے تھے اور ہم ان کو

دائیں بائیں کروٹ دیتے رہتے تھے اور ان کا کتا دونوں ہاتھ پسارے چوکھٹ پر (بیٹھا) تھا، اگر آپ ان کو جھانک کر دیکھتے تو پیٹھ پھیر کر بھاگ نکلتے اور یقیناً آپ کے اندر ان کی دہشت سما جاتی۔

اس کے بعد تیسرا منظر ان کے اٹھنے کا بیان کیا گیا ہے۔

﴿وَكَذَٰلِكَ بَعَثْنَاهُمْ لِيَتَسَاءَلُوا بَيْنَهُمْ قَالَ قَائِلٌ مِّنْهُمْ كَمْ لَبِثْتُمْ قَالُوا لَبِثْنَا يَوْمًا أَوْ بَعْضَ يَوْمٍ قَالُوا رَبُّكُمْ أَعْلَمُ بِمَا لَبِثْتُمْ فَابْعَثُوا أَحَدَكُم بِوَرِقِكُمْ هَٰذِهِ إِلَى الْمَدِينَةِ فَلْيَنظُرْ أَيُّهَا أَزْكَىٰ طَعَامًا فَلْيَأْتِكُم بِرِزْقٍ مِّنْهُ وَلْيَتَلَطَّفْ وَلَا يُشْعِرَنَّ بِكُمْ أَحَدًا﴾ (سورہ کہف:۱۹)

اور اسی طرح ہم نے ان کو اٹھا دیا تا کہ وہ ایک دوسرے سے پوچھیں، ان میں ایک بولا: کتنی مدت تم لوگ ٹھہرے ہو گے (کچھ) بولے ایک آدھ دن ٹھہرے ہوں گے (دوسروں) نے کہا جتنی مدت تم ٹھہرے تمہارا رب اس کو خوب جانتا ہے، اپنے ان سکوں کے ساتھ کسی کو شہر بھیجو تو وہ خوب دیکھ بھال لے کہ زیادہ پاکیزہ کھانا وہاں کہاں (مل سکتا) ہے تو وہ اس میں سے کچھ تمہارے لیے لے آئے اور وہ ہوشیاری برتے اور ہرگز کسی کو تمہاری بھنک نہ لگنے دے۔

سورہ مریم میں منظر کشی

اسی طرح حضرت مریم علیہا السلام کے قصہ میں ارشاد ہے۔

﴿وَاذْكُرْ فِي الْكِتَابِ مَرْيَمَ إِذِ انتَبَذَتْ مِنْ أَهْلِهَا مَكَانًا شَرْقِيًّا فَاتَّخَذَتْ مِن دُونِهِمْ حِجَابًا﴾ (سورہ مریم:۱۶-۱۷)

اور کتاب میں مریم کا بھی تذکرہ کیجیے جب وہ اپنے گھر والوں سے جدا ہو کر مشرقی سمت کی طرف ایک جگہ چلی گئیں پھر انہوں نے ان سے پردہ کر لیا۔

﴿فَنَادَاهَا مِن تَحْتِهَا أَلَّا تَحْزَنِي قَدْ جَعَلَ رَبُّكِ تَحْتَكِ سَرِيًّا، وَهُزِّي إِلَيْكِ بِجِذْعِ النَّخْلَةِ تُسَاقِطْ عَلَيْكِ رُطَبًا جَنِيًّا، فَكُلِي وَاشْرَبِي وَقَرِّي عَيْنًا فَإِمَّا

تَرَيِنَّ مِنَ الْبَشَرِ أَحَداً فَقُولِيْ إِنِّيْ نَذَرْتُ لِلرَّحْمٰنِ صَوْماً فَلَنْ أُكَلِّمَ الْيَوْمَ إِنسِيّاً﴾۔(سورہ مریم:۲۴-۲۶)

بس ان کے نیچے ہی سے اس نے آواز دی کہ غم نہ کیجیے، آپ کے رب نے آپ کے نیچے ایک چشمہ بنادیا ہے اور درخت کی ٹہنی پکڑ کر اپنی طرف ہلایئے آپ کے پاس تازہ کھجوریں گریں گی، تو کھایئے، پیجیے اور اپنی آنکھیں ٹھنڈی کیجیے، پھر اگر انسانوں میں کوئی بھی نظر آئے تو کہہ دیجیے کہ میں نے رحمٰن کے لیے روزہ کی نذر مانی ہے تو آج میں کسی انسان سے بات نہ کروں گی۔

طبیعت انسانی کی تصویر میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کا مطالبہ۔

﴿رَبِّ أَرِنِيْ أَنظُرْ إِلَيْكَ﴾۔(سورہ اعراف:۱۴۳)

میرے رب تو مجھے دیدار کرادے

ابراہیم علیہ السلام کا تاثر

حضرت ابراہیم علیہ السلام کا چاند تاروں کو دیکھ کر تأثر

﴿فَلَمَّا جَنَّ عَلَيْهِ اللَّيْلُ رَأَى كَوْكَباً قَالَ هَـذَا رَبِّيْ فَلَمَّا أَفَلَ قَالَ لا أُحِبُّ الآفِلِيْنَ، فَلَمَّا رَأَى الْقَمَرَ بَازِغاً قَالَ هَـذَا رَبِّيْ فَلَمَّا أَفَلَ قَالَ لَئِن لَّمْ يَهْدِنِيْ رَبِّيْ لأَكُونَنَّ مِنَ الْقَوْمِ الضَّالِّيْنَ، فَلَمَّا رَأَى الشَّمْسَ بَازِغَةً قَالَ هَـذَا رَبِّيْ هَـذَا أَكْبَرُ فَلَمَّا أَفَلَتْ قَالَ يَا قَوْمِ إِنِّيْ بَرِيءٌ مِّمَّا تُشْرِكُونَ﴾ [سورہ انعام:۷۶-۷۸]

پھر جب رات ان پر چھا گئی تو انہوں نے ایک ستارہ دیکھا، بولے یہ میرا رب ہے، پھر جب وہ غائب ہوگیا تو فرمایا کہ میں غائب ہوجانے والوں کو پسند نہیں کرتا، پھر جب انہوں نے چاند کو چمکتے ہوئے دیکھا تو بولے یہ میرا رب ہے، پھر جب وہ بھی غروب ہوگیا تو فرمانے لگے کہ اگر میرے رب نے مجھے راستہ نہ دیا تو میں ضرور گمراہ لوگوں میں ہوکر رہ جاؤں گا، پھر سورج کو دمکتا ہوا دیکھا تو بولے یہ

میرا رب ہے، یہ سب سے بڑا ہے، پھر جب وہ بھی غروب ہوگیا تو فرمایا اے میری قوم جس کو بھی تم شریک کرتے ہو میں اس سے بالکل بے تعلق ہوں۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی خواہش

﴿ رَبَّنَا أَنزِلْ عَلَيْنَا مَآئِدَةً مِّنَ السَّمَاءِ تَكُونُ لَنَا عِيدًا لِّأَوَّلِنَا وَآخِرِنَا وَآيَةً مِّنكَ وَارْزُقْنَا وَأَنتَ خَيْرُ الرَّازِقِينَ ﴾[سورہ مائدہ:۱۱۴] ۔

اے اللہ ہم پر آسمان سے بھرا ایک خوان اتار دے کہ وہ ہمارے اگلوں پچھلوں کی عید ہو جائے اور تیری ایک نشانی ہو اور تو ہمیں رزق عطا فرما دے، بلاشبہ تو سب سے بہتر رزق دینے والا ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کا فرعون سے مخاطب ہونا اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اپنے باپ سے اور پھر بادشاہ وقت سے مخاطبت، اس طرح متعدد مثالیں ہیں، جن میں فنی خصوصیات پائی جاتی ہیں، جو قرآن کے اعجاز بیانی میں آتی ہیں۔

بیان کے اعتبار سے اور قصہ کے اجزاء کے انتخاب اور ترتیب کے اعتبار سے سید قطب شہید نے اپنی کتاب ''التصوير الفني في القرآن'' میں اس پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے، ہم یہاں اس کا خلاصہ پیش کرتے ہیں۔ سید قطب شہید لکھتے ہیں:۔

''قرآنی قصہ (واقعہ نگاری) کی فنی خصوصیات میں پہلی چیز واقعہ کے طریقہ اظہار و بیان کا تنوع ہے، دوسری فنی خصوصیت طریق مفاجات کا تنوع ہے، واقعہ نگاری کی تیسری فنی خصوصیت وہ وقفہ اور خلا ہے جو ایک منظر اور دوسرے منظر میں پایا جاتا ہے، اس طرح ایک سین کے بعد وقفہ کر کے دوسرے منظر سے الگ کیا جاتا ہے وقفہ کے طرز کو جملہ قرآنی آیات میں ملحوظ رکھا گیا ہے، اس کی مثال حضرت یوسف علیہ السلام کے قصہ میں نمایاں طور پر ملتی ہے، قصہ کی چوتھی فنی خصوصیت منظر کشی ہے، قرآن جو مشاہد و مناظر بھی پیش کرتا ہے، ان کی اس انداز سے منظر کشی کرتا ہے کہ اس کا سامع اور ناظر اس کو ماضی کا واقعہ یا حادثہ نہیں بلکہ زمانہ حال

کا ایک واقعہ تصور کرتا ہے جو اس کی آنکھوں کے سامنے رونما ہو رہا ہے، قصہ کے مشاہد و مناظر کی جو تصویر کھینچی جاتی ہے اس کے مختلف انداز و اطوار ہیں، ایک رنگ تو وہ ہے جو کسی واقعہ کو پیش کرنے اور اس کو زندہ کرنے میں نمایاں ہوتا ہے، دوسرا رنگ جذبات و احساسات کی منظر کشی میں ظاہر ہوتا ہے اور تیسرا رنگ شخصیات کی تصویر کشی میں ابھرتا ہے، یہ مختلف رنگ جداگانہ طور پر نہیں ہوتے بعض مواقع میں ان میں سے ایک رنگ نمایاں تر ہو کر دوسرے دو رنگوں پر غالب آجاتا ہے، اور ان کو پھر اسی نام سے موسوم کیا جاتا ہے، حق بات تو یہ ہے کہ جملہ واقعات کے مناظر میں یہ تمام فنی رنگ ظاہر ہوتے ہیں، اس کی مثال باغ والوں کا واقعہ، بنائے کعبہ کے وقت حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل علیہما السلام کی کیفیت، حضرت نوح اور ان کے بیٹے اور طوفان کا واقعہ، اور اسی طرح اصحاب کہف کا واقعہ۔ جذبات اور احساسات کی تصویر کشی کی مثال حضرت مریم کا واقعہ ہے، اور قرآنی واقعات میں شخصیت نگاری کی مثال دو باغ والوں کا قصہ، حضرت موسیٰ اور حضرت خضر کے واقعات شخصیت نگاری کے اعلیٰ نمونے ہیں، اسی طرح حضرت ابراہیم، حضرت یوسف، حضرت آدم، حضرت سلیمان علیہم السلام کے تذکروں میں بھی شخصیت نگاری کے اعلیٰ نمونے موجود ہیں"۔

قرآن مجید میں قصہ نگاری مقصود بالذات نہیں، قرآن نے جس طرح دینی مقاصد کو پورا کرنے کے لیے دیگر ذرائع اختیار کیے ہیں، اسی طرح قصہ گوئی بھی ان میں سے ایک ہے، قرآن کا بنیادی مقصد دعوت دین ہے، اور قصہ گوئی یا قصہ نگاری دعوتِ دین کی تبلیغ و ترسیل کا ایک ذریعہ ہے، لہٰذا قرآن جس طرح قیامت اور اخروی ثواب و عتاب کی منظر نگاری کرتا ہے، بعث بعد الموت اور قدرت خداوندی کے اثبات میں دلائل دیتا ہے، شریعت کی تفصیل بیان کرتا ہے، اور ضرب الامثال بیان کرتا ہے، بالکل اسی طرح وہ اپنی دعوت کو لوگوں تک پہنچانے کے لیے واقعات بیان کرتا ہے۔

لہذا قرآن کے بیان کردہ واقعات اپنے موضوع، طرز ادا اور حوادث کے رونما ہونے کے اعتبار سے دینی مقاصد کے زیر اثر ہیں، مگر دینی مقاصد کے تابع ہونے کے یہ معنی نہیں ہیں کہ واقعات کو پیش کرنے میں فنی خصوصیات کو بھی نظر انداز کر دیا ہے، بلکہ دینی مقاصد کو پورا کرنے کے ساتھ ساتھ قرآنی واقعات فنی خصوصیات کے بھی حامل ہیں، خصوصا قرآنی تعبیر و بیان کی عظیم خصوصیت یعنی منظر نگاری تو اسکا لازمی حصہ ہے۔ سید قطب شہید قرآنی اسلوب میں فنی اور دینی مقاصد کے حسین امتزاج پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

''قرآنی اسلوب دینی وفنی اغراض ومقاصد کا حامل وجامع ہے، قرآن کے پیش کردہ صور ومشاہد میں دونوں اوصاف پوری طرح موجود ہیں، قرآن فنی حسن وجمال کو وجدانی تاثیر کے وسیلہ کے طور پر استعمال کرتا ہے، اس لیے وہ وجدان کی دینی حس کو فنی حسن وجمال کی زبان میں مخاطب کرتا ہے، ظاہر ہے فن اور دین دونوں باہم لازم ملزوم ہیں، اور ان کا قرار نفس انسانی اور حواس کی گہرائی میں ہے، جمال فنی کا فہم وادراک اس بات کی دلیل ہے، کہ نفس انسانی میں دینی تاثیر کے اخذ وقبول کی استعداد موجود ہے، یہ اسی وقت ممکن ہے جب فن اپنے اوج کمال کو پہنچا ہوا ہو، اور اس کے ساتھ ساتھ نفس حسن وجمال کے پیغام کو حاصل کرنے کے لیے تیار ہو''۔

ترجمہ قرآن: فن اور مشکلات

اس میں شک نہیں کہ قرآن مجید کے ترجمہ کا کام بڑا ہی نازک اور انتہائی خطرناک ہے، مترجم کی ثقافت اور دونوں زبانوں کے مزاج وخصوصیات سے واقفیت کا اثر ترجمہ پر پڑتا ہے، عربی زبان سے واقفیت، عربی ماحول ومزاج، قرآن مجید کے زمانۂ نزول کے حالات، پس منظر، عربی زبان کے علوم سے واقفیت اور ان میں مہارت اور عربی زبان کے مفہوم کو دوسری زبان میں منتقل کرنے کی صلاحیت کا ترجمہ پر اثر انداز ہونا لازمی ہے، اس لیے کہ عربی زبان دوسری زبانوں کے مقابلہ میں کئی اعتبار سے ممتاز اور منفرد ہے، عربی زبان میں ایک لفظ کے معنی موقع ومحل کے اعتبار سے بدل جاتے ہیں، اسی طرح صلات، ضمائر، فواصل، تقدیم وتاخیر، متکلم ومخاطب کے صیغوں کی تبدیلی اور سیاق وسباق سے معانی میں تبدیلی ہوجاتی ہے، مترجم کی قوت فہم وادراک اور عربی زبان کے ذوق ہی نہیں، مزاج اور فکری رجحان سے بھی تراجم میں فرق پڑجاتا ہے، جو شخص بھی مختلف تراجم کا جائزہ لے گا اور ان کا موازنہ کرے گا تو اس کے سامنے یہ حقیقت واضح ہوکر آجائے گی کہ قرآن کے معانی کا پوری طرح کسی دوسری زبان میں منتقل کرنا کسی صورت میں بھی ممکن نہیں ہے، بہت سے مصنفین نے قرآن مجید کی بلاغت فصاحت، اعجاز اور مشکل قرآنی الفاظ کے حل پر رہنما کتابیں لکھی ہیں اور یہ بتایا ہے کہ کس طرح قرآنی الفاظ کے اصل مفہوم تک رسائی ہوسکتی ہے اور یہ اعتراف کیا ہے کہ قرآن مجید نے جن لفظی اور معنوی رعایتوں کا لحاظ رکھا ہے اور جو باریکیاں اور قوت وتأثیر ان کے اندر پنہاں ہیں ان تمام باریکیوں اور ظاہری ومعنوی محاسن اور فنی اور ادبی خوبیوں کا دوسری زبان میں دونوں زبانوں میں ماہر ادیبوں کے لیے بھی مشکل ہوتا ہے چہ جائیکہ ان لوگوں کے لیے جو عربی زبان سے بہت کم واقفیت رکھتے ہوں اور ان کی ثقافت بھی محدود ہو۔

مفسر اور مترجم قرآن کے لیے شرائط

علامہ سیوطی نے مفسر قرآن کریم کے لئے پندرہ علوم پر مہارت ضروری بتلائی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:۔

"يجوز تفسيره لمن كان جامعاً للعلوم التي يحتاج إليها المفسر و هي خمسة عشر: اللغة، والنحو، والتصريف، والاشتقاق، والمعاني، والبيان، والبديع، والقراءة، وأصول الدين، وأصول الفقه، والأحاديث المبينة لتفسير المجمل والمبهم، وعلم الموهبة وهو علم يورثه الله لمن عمل بما علم، وإليه الإشارة بحديث "من عمل بما علم يورثه الله علم ما لم يعلم" (مشکلات القرآن، از: علامہ انور شاہ کشمیری)۔

شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا کاندھلوی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی مفسر اور مترجم قرآن کریم کے لئے پندرہ علوم پر مہارت ضروری بتلائی ہے، وہ لکھتے ہیں:۔

"مفسر اور مترجم قرآن کریم کے لئے پندرہ علوم پر مہارت حاصل کرنا ضروری ہے: (۱) لغت، جس سے کلام پاک کے مفرد الفاظ کے معنی معلوم ہو جاویں۔ (۲) نحو کا جاننا ضروری ہے، اس لئے کہ اعراب کے تغیر و تبدل سے معنی بالکل بدل جاتے ہیں اور اعراب کی معرفت نحو پر موقوف ہے۔ (۳) صرف کا جاننا ضروری ہے، اس لئے کہ بنا اور صیغوں کے اختلاف سے معانی بالکل مختلف ہو جاتے ہیں، ابن فارس کہتے ہیں کہ جس شخص سے علم صرف فوت ہو گیا اس سے بہت کچھ فوت ہو گیا۔ (۴) اشتقاق کا جاننا ضروری ہے۔ (۵) علم معانی کا جاننا ضروری ہے۔ (۶) علم بیان کا جاننا ضروری ہے۔ (۷) علم بدیع کا جاننا ضروری ہے۔ (یہ تینوں فن علم بلاغت کہلاتے ہیں)۔ (۸) علم قرأت کا بھی جاننا ضروری ہے۔ (۹) علم عقائد کا بھی جاننا ضروری ہے۔ (۱۰)

اصول فقہ معلوم ہونا ضروری ہے۔ (۱۱) اسباب نزول کا معلوم ہونا ضروری ہے۔ (۱۲) ناسخ ومنسوخ کا معلوم ہونا بھی ضروری ہے۔ (۱۳) علم فقہ کا معلوم ہونا بھی ضروری ہے۔ (۱۴) ان احادیث کا جاننا ضروری ہے جو قرآن پاک کی مجمل آیات کی تفسیر واقع ہوئی ہیں۔ (۱۵) ان سب کے بعد پندرھواں وہ علم وہبی ہے جو حق سبحانہ وتقدس کا عطیۂ خاص ہے، اپنے مخصوص بندوں کو عطا فرماتا ہے جس کی طرف اس حدیث شریف میں اشارہ ہے "من عمل بما علم ورّثہ اللہ علم مالم یعلم" (جب بندہ اس چیز پر عمل کرتا ہے جس کو جانتا ہے تو حق تعالیٰ شانہ ایسی چیزوں کا علم عطا فرماتے ہیں جن کو وہ نہیں جانتا)۔ (فضائل قرآن، ص:۱۵)۔

قرآنی الفاظ کی شرح میں متقدمین کی احتیاط

قرآن کریم کے ترجمہ کی ایسے بہت سے لوگوں نے کوشش کی، جن کے اندر اس غیر معمولی اور عظیم خدمت سے عہدہ برآ ہونے کی صلاحیت نہ تھی، علماء نے قرآن مجید کے معانی کو دوسری زبانوں میں منتقل کرنے کی جو بہت سی شرائط رکھی ہیں افسوس ہے کہ بہت سے مترجمین نے ان کا لحاظ نہیں رکھا، جب کہ علماء سلف اس معاملہ میں انتہائی ذکی الحس واقع ہوئے تھے، وہ اس بارے میں اتنے محتاط تھے کہ قرآنی الفاظ کی شرح میں بھی ان کو تردد ہوتا تھا، علامہ اصمعی جیسے امام ادب نے قرآنی لفظ "الخبز" کے معنی اس لیے نہیں بتاتے کہ معلوم نہیں اس سے کیا مراد ہے؟۔

ترجمۂ قرآن کی دشواریاں

عصر حاضر کے سب سے بڑے ادیب مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی جنکا ترجمۂ قرآن (انگریزی اور اردو) بہت مقبول ہوا اور انہوں اس کی کوشش کہ قرآن کریم کے اعجاز کے مختلف پہلوؤں کو ادا کیا جاسکے، اس کا اعتراف کیا ہے کہ قرآنی الفاظ اور تعبیرات کو دوسری زبان میں منتقل کرنے میں بہت سی دشواریاں ہیں، وہ لکھتے ہیں:۔

''کتاب کسی بھی زبان کی ہو اگر ادبی اعتبار سے بلند اور معنوی لحاظ سے عظیم ہے تو اسے کسی دوسری زبان میں منتقل کرنا آسان نہیں ہے، ہر صاحب قلم کے لئے کٹھن بلکہ کہنا چاہئے کہ صبر آزما ہے، ہر زبان کی ساخت الگ ہوتی ہے، ترکیبیں جداگانہ، نشست الفاظ کی ایک ہیئت مخصوص، صرف ونحو کے قاعدوں اور ضابطوں کی ایک وضع خصوصی اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ہر لفظ اپنی زبان میں جو ضمنی مدلولات اور مخفی اشارات وکنایات رکھتا ہے، انہیں زبان ترجمہ کے کسی لفظ میں بعینہ کیونکر لایا جاسکتا ہے؟ ترجمہ میں اگر پابندی زبان ترجمہ کے طور طریقوں، ترکیبوں، بندشوں، محاوروں اور روزمرہ کی رکھیئے تو یہ اپنانا ہوا، ترجمہ کرنا نہ ہوا، زیادہ سے زیادہ اسے ترجمانی کہہ لیجئے اور کہیں التزام اصل لفظ کی جگہ لفظ رکھ دینے کا کرلیا، اور تکیہ تمام تر لغت وفرہنگ کی کتابوں پر رکھا تو عبارت ایسی سپاٹ اور بے رنگ وبے کیف بن جائے گی کہ خود اپنی طبیعت بدحظ ہوکر رہے گی اور جی اس کے پڑھنے پڑھانے میں نہ لگے گا''۔

''شرح وتفسیروں کی بحثوں کو ذرا دیر کے لیے چھوڑیے، محض سادے ترجمے کو لیجئے، اردو عربی کے درمیان فرق نحوی وصرفی، اسلوبی وانشائی حیثیت سے گو مشرق ومغرب کا ہے، عربی میں جو اسلوب بیان فصاحت کے اعلیٰ معیار پر ہے اور اردو میں آکر غیر فصیح ہی نہیں، مہمل بن جاتا ہے، عربی میں زور وتاکید کے موقع پر ضمیر کو بے تکلف مکرر بلکہ تین تین بار لے آتے ہیں، جیسے ''إنہ ہو یبدئ ویعید'' ''إنک أنت العزیز الحکیم'' ''إننا سمعنا'' ''إنني أنا اللہ'' ''إنا نحن نحي الموتی'' ''نحن نزلنا الذکر وإنا لہ لحفظون'' اگر لفظی ترجمہ کی دھن میں اس قسم کی ترکیبوں میں اردو میں بھی ضمیر غائب ''وہ'' یا ضمیر حاضر ''تو'' یا ضمیر متکلم ''میں'' یا ''ہم'' دہرا کر یا تہرا کر لائی جائے تو عبارت تو غارت ہو ہی جائے گی، لازما اردو میں اس ضمیر کی تکرار سے نہیں، بلکہ ضمیر کے ساتھ کہیں ''ہی'' سے کام

لیا جائے گا، اور کہیں ''ہی'' اور ''تو'' دونوں کا ملا کر کام لیا جائے گا''۔

''اسی طرح اردو میں حال و مستقبل دو صیغے مستقل اور الگ الگ ہیں، عربی میں دونوں کے لیے ایک ہی صیغہ بنتا ہے، جسے بجنسہ اردو میں لانے کی کوئی شکل نہیں ہے اور ترجمہ کے لیے ناگزیر ہے کہ دو میں سے کوئی ایک صیغہ حسب مقتضائے مقام اردو کے لیے متعین کر دیا جائے''۔

''ایک بڑا مرحلہ ترجمہ کے لیے لغات اضداد کا ہے، عربی میں متعدد لفظ ایسے ہیں جو متضاد مفہوم کے لیے آتا ہیں، مثلاً شراء کے معنی خریدنے اور فروخت کرنے دونوں کے لیے آتا ہے، رجاء امید و بیم دونوں کے لیے استعمال ہوتا ہے''۔

پھر ایک بڑی دقت ان الفاظ قرآنی سے پیدا ہوگئی ہے جو اردو میں چل گئے ہیں، بلکہ ہماری زبان میں گھل مل گئے ہیں، یہ چیز تو بظاہر بڑی آسانی پیدا کرنے والی ہے اور نو آمیز مترجم اس دھوکہ میں پڑ جاتا ہے کہ ان کے ترجمہ کی ضرورت ہی کیا، یہ تو خود اردو بن گئے ہیں، لیکن حقیقت حال اس کے بالکل برعکس ہے، یہ لفظ اردو میں آتو بیشک گئے ہیں، لیکن اپنے مفہوم قرآنی سے الگ ہوکر، مترجم نے اگر انہیں کہیں اسی طرح اردو میں منتقل کر دیا تو نادانستہ اور غیر شعوری طور پر مفہوم قرآنی سے بہت دور جا پڑے گا، اشتراک صوری کے باوجود اختلاف معنوی کی ممکن صورتیں تین ہیں اور تینوں ہی ترجمۂ قرآن کے سلسلہ میں بکثرت پائی جاتی ہیں۔

ا۔ زیادہ تر تو ایسا ہے کہ قرآن مجید نے ایک لفظ وسیع و عمومی معنی میں استعمال کیا ہے، لیکن بعد کو عربی میں اس کا ایک محدود اور متعین اصطلاحی مفہوم قائم ہوگیا اور اردو میں منتقل ہوکر اس کا وہی آخری مفہوم آیا، اس کی ایک روشن مثال لفظ ''قتل'' ہے، قرآن نے اسے لغوی وسیع عمومی مفہوم میں لیا ہے، یعنی جان لینے یا مطلق ہلاک کرنے کے معنی میں، بعد کو یہی لفظ ایک اصطلاح فقہی بن گیا اور اب اس

کے معنی ''کسی دھار دار آلہ سے ہلاک کرنے'' تک محدود ہو گئے اور اردو میں رائج یہی محدود اصطلاحی مفہوم ہو گیا، ایسے الفاظ کی مثالیں کثرت سے ملیں گی۔

رب، جہاد، ظلم، وثوق، شراب، آیت، خیر، زکوۃ، فضل، دین، عرش، سماء، جاہل، نسل، مکر، کید، اجل، مجاہدین، شیطان، جنت وغیرہا پچاسوں قرآنی لفظ اس قبیل کے ہیں، کہ انہیں ہر جگہ اردو ترجمہ میں منتقل کر دینا فہم قرآنی پر شدید ظلم کرنا ہوگا۔

۲۔ کہیں صورت حال اس سے مختلف ہے، یعنی قرآن میں متجانس کیفیات یا مماثل اشیاء کے لئے الفاظ کئی کئی آئے ہیں، مگر اردو میں ان کے ادا کرنے کو لفظ بس ایک ہی دو موجود ہیں جیسے اردو میں ایک لفظ ''سانپ'' ہے، قرآن مجید اس کے لئے تین تین لفظ تھوڑے تھوڑے سے فرق کے اظہار کے لئے لایا ہے، کہیں ''حیۃ'' کہیں ''جانّ'' کہیں ''ثعبان''، یا اردو لفظ ''اونٹ'' ہے، قرآن مجید تین تین لفظ لایا ہے، کہیں ''بعیر'' کہیں ''جمل'' کہیں ''ابل''۔ عربی زبان خصوصاً قرآنی زبان کی وسعتوں کا کہنا ہی کیا؟ دن رات کے مختلف اوقات کے لئے اردو میں مستعمل لفظ صرف چار ہیں، صبح، شام، دوپہر، سہ پہر، قرآن مجید نے اوقات شب و روز کے لئے کم سے کم دس لفظ اختیار کئے ہیں، بکرۃ، اصیل، ضحیٰ، غسق، فجر، صبح، غدو، عشیۃ، ظہیرۃ، عصر، اب اتنے لفظوں کے ٹھیک مقابل اردو لفظ کہاں سے لائے جائیں؟۔

اسی طرح اردو میں ایک لفظ ''ڈرنا'' ہے، یا اس کا متعدی ''ڈرانا'' آتا ہے، قرآن مجید نے اس کے لئے سات سات مادوں سے کام لیا ہے، خوف، خشیت، وجل، تقوی، حذر، اشفاق، رھبۃ، ایک اور مفہوم ہے جس کے لئے اردو میں ''جماعت'' یا ''گروہ'' ہی سے کام چلانا پڑتا ہے، قرآن مجید نے اسے سات سات طریقوں سے تعبیر کیا ہے، فئۃ، طائفۃ، حزب، نفر، عصبۃ، فریق، فرقۃ، اسی طرح اردو کے ایک لفظ ''چھپانے'' کے لئے قرآن مجید میں کئی لفظ مل

جاتے ہیں، کہیں تخفون، کہیں تسرون، کہیں تستر ون، کہیں تکتمون، ایسے ہی اس کے مقابل مفہوم کے لئے اردو میں کام صرف کھونے یا ظاہر کرنے سے چلایا جاتا ہے، لیکن قرآن مجید میں اس کے لئے کہیں تبدون ہے، کہیں تخرجون، کہیں تعلنون، کہیں تجھرون، علی ہذا، قرآن کے الخالق اور البارئ اور الفاطر اور بدیع گو متقارب المعنی ہیں پھر بھی چار مستقل مفہوموں کو بیان کرنے والے ہیں ،اردو میں ان کے الگ الگ مترادفات مشکل ہی سے مل سکیں گے۔

۳۔ان دونوں صورتوں یعنی کہیں تحدید و تخصیص اور کہیں تعمیم وتوسیع کے علاوہ ایک تیسری صورت یہ بھی ہے:۔

(الف)۔یا تو قرآنی لفظ نے اردو میں آکر ایک دوسرے معنی اختیار کر لیے ہیں۔

(ب)۔اور یا اس نے دو مشہور قرآنی مفہوموں کے بجائے صرف ایک ہی مفہوم اردو میں قبول کیا ہے اور ایسے لفظ دو چار نہیں، کثرت سے ملیں گے، مثلاً یہ یا ان کے مشتقات:۔

وسیلہ، محراب، فوج، ذرۃ، غلام، مشفق، ناصح، غصہ، غرور، عارض، اعتبار، تأویل، کشف، فتح، ارث، بلاء، قاصد، فتنہ، فلک، عام، سیارۃ، ذکر، حظ، بری، اسباب، نہر، اعلام، مجنون، شہید، رقیب، قہر، عورۃ، ممنون، صاحب، تکلیف اور ظاہر ہے کہ یہ تینوں فہرستیں محض نمونے کے طور پر درج ہوئیں، احاطہ واستقصاء مقصود نہیں"۔(مقدمہ تفسیر ماجدی، جلد اول:۱۱-۱۲)۔

ترجمۂ قرآن کے لیے بنیادی ضرورت

مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتاب "مطالعۂ قرآن کے اصول ومبادئ" میں ترجمۂ قرآن کی دشواریوں کا تذکرہ کرتے ہوئے مستشرقین کا ذکر کیا ہے کہ:

''وہ نہ عربی زبان وثقافت سے واقف تھے اور نہ ہی اسلامی ماحول اور تہذیب سے ان کی شناسائی تھی، ایسے لوگوں نے قرآن کی غلط ترجمانی کی، اسی طرح بعض علماء جو اگر چہ مسلمانوں میں ایک مقام رکھتے تھے لیکن قرآن مجید کے ترجمہ میں جس ادبی ذوق اور عربی زبان سے جس گہری واقفیت اور تعبیر پر جس غیر معمولی قدرت کی ضرورت ہوتی ہے وہ چونکہ اس سے یکسر خالی تھے، اس لئے ان کے تراجم سے بہت سے مغالطے اور غلط فہمیاں پیدا ہوئیں''۔

قرآن کے اعجازی پہلو

حضرت مولانا لکھتے ہیں:۔

''قرآن مجید صرف اپنے الفاظ وترکیب اور فصاحت وبلاغت ہی کے اعتبار سے معجزہ نہیں ہے، بلکہ وہ اپنے الفاظ اور ترکیب میں بھی معجزہ ہے، اپنے معانی ومضامین میں بھی، اپنے اعلیٰ علوم ومعارف میں بھی، معلومات غیبی اور حقائق ابدی میں بھی، اپنی پیش کی ہوئی مذہبی واخلاقی ومعاشرتی اور مدنی تعلیمات میں بھی، اپنے اثرات وانقلابات میں بھی، اپنی پیشگوئیوں اور اخبار میں بھی معجزہ ہے، مگر جب صرف الفاظ میں جو اس کے اعجاز کامل کا صرف ایک پہلو اور گوشہ ہے کوئی مقابلہ نہیں ہوسکا تو اس کے اعجاز کامل میں کیا مماثلت ہوسکتی ہے؟''۔(ص:۴۵-۴۶)

پرخطر کام

حضرت مولانا نے یہ بھی لکھا ہے:۔

''قرآن مجید میں جدید علمی (سائنٹفک) حقائق کو تلاش کرنے اور ایک طرف اس کے بعض اشارات اور اجمالی بیانات، اور دوسری طرف جدید تحقیقات واکتشافات میں تطبیق (جس کی سب سے بڑے پیمانہ پر کوشش اس

صدی میں علامہ طنطاوی جوہری مصری نے اپنی مشہور تفسیر ''جواہر القرآن'' میں کی ہے) بڑا نازک اور کسی حد تک پرخطر کام ہے، اس لئے کہ اس کا قوی امکان ہے (اور علم وتحقیق کی تاریخ میں اس کا کئی بار تجربہ ہو چکا ہے) کہ علم وتحقیق کے یہ نتائج جو اس وقت بالکل بدیہی اور ثابت شدہ حقائق سمجھے جارہے ہیں، بالکل بدل جائیں، یا ان کا ثبوت وقطعیت مجروح ومشکوک ہو جائے، نیز اس علمی کاوش میں (جس کی نیک نیتی اور کسی قدر افادیت میں شک نہیں کیا جاسکتا) قرآن کے اصل موضوع ومقصد سے دوری اور جدید علم وتحقیق سے مرعوبیت کا شائبہ بھی پایا جاتا ہے''۔

ترجمہ قرآن میں ان ساری چیزوں کا خیال رکھنا اور ان ساری خوبیوں کو باقی رکھنا مشکل ہے، لیکن ان دشواریوں کے باوجود اس دور میں دنیا کی مختلف زبانوں (فرنچ، ڈچ، جرمن، جاپانی، اور اسپینش) میں قرآن کریم کے ترجمہ ہو رہے ہیں اور پڑھنے والے متاثر ہو رہے ہیں۔

ہندوستان میں اردو اور مقامی زبانوں میں قرآن کے ترجمے ہو رہے ہیں، یہ مترجم حضرات اپنے تراجم میں دوسرے تراجم پر اعتماد کرنے پر مجبور ہیں۔

اردو میں قرآن کے تراجم

ہندوستان میں قرآن کے ترجمہ میں حکیم الاسلام حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی (۱۱۱۴ھ-۱۱۷۶ھ) اور ان کے گھرانے کو سبقت حاصل ہوئی، جن میں حضرت شاہ عبدالقادر دہلوی (متوفی ۱۲۳۰ھ) کی ''موضح القرآن'' نے بڑی شہرت اور مقبولیت پائی اور اس کو پیش نظر رکھ کر ہمارے علماء نے لوگوں کے فہم اور زبان کی نزاکت کا خیال کرتے ہوئے اس عمل کو برابر جاری رکھا۔

چودھویں صدی ہجری میں حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ (متوفی ۱۳۶۲ھ-۱۹۴۳ء) کی شخصیت اپنی ہمہ جہت علمی، دینی، تحقیقی، اصلاحی اور

دعوتی خدمات کے ساتھ سامنے آئی اور ان کی چھوٹی بڑی تصنیفات ورسائل کا شمار کیا گیا تو وہ ایک ہزار کے قریب پہنچیں، جن میں علمی، تحقیقی، اصلاحی اور دعوتی کتابوں اور مواعظ وملفوظات کے ذخیرہ کے علاوہ ان کے تفسیری افادات اور ترجمۂ قرآن پر مشتمل کتاب ''بیان القرآن'' کو بڑی مقبولیت ملی۔

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کے تفسیری علوم وتحقیقات سے استفادہ کرنے والوں میں مولانا مفتی محمد شفیع عثمانی دیوبندی صاحب ''معارف القرآن'' کے ساتھ مولانا عبدالماجد دریابادی (متوفی ۱۳۹۷ھ/۱۹۷۷ء) کا نام بھی ہے جنہوں نے مزید اپنی تحقیقات کے ساتھ انگریزی اور اردو زبانوں میں بڑا تفسیری ذخیرہ چھوڑا جس کی اشاعت کی سعادت مجلس تحقیقات ونشریات اسلام کو حاصل ہوئی، مولانا عبدالباری ندویؒ کا بھی تفسیری کام تھا جس سے مولانا عبدالماجد دریابادی نے فائدہ اٹھایا مگر وہ منظر عام پر نہ آسکا۔

علامہ سید سلیمان ندویؒ جو علمی ولغوی صلاحیتوں کے نہ صرف مالک تھے؛ بلکہ اعلیٰ قرآنی فہم وذوق بھی رکھتے تھے اور حدیث پاک اور سیرت نبوی کے جزئیات پر بھی گہری نظر تھی اور تاریخ کا بڑا اچھا مطالعہ تھا، انہوں نے تلاوت کے دوران جو نوٹس قلم بند کیے تھے اور اپنی مختلف تحریروں میں جو افادات اور نکات پیش کیے تھے، وہ مجلس تحقیقات ونشریات اسلام (لکھنو) سے اردو میں ''تفسیری نکات'' اور عربی میں ''مفردات القرآن'' کے نام سے شائع ہو چکے ہیں، جمع وترتیب اور تعریب کا کام مولوی محمد فرمان نیپالی ندوی نے کیا ہے۔

مشہور اردو تفسیروں میں ''ترجمہ تفسیر فتح العزیز'' از مولانا شاہ عبدالعزیز دہلوی متوفی ۱۲۳۹ھ، ''ترجمہ تفسیر مظہری'' از قاضی ثناء اللہ پانی پتی متوفی ۱۲۲۵ھ، ''فتح المنان معروف بہ تفسیر حقانی'' از ابومحمد عبدالحق حقانی دہلوی متوفی ۱۲۴۷ھ، ''بیان القرآن'' از احمد علی لاہوری متوفی ۱۲۶۸ھ، ''غایۃ البیان فی تفسیر القرآن'' از احمد حسن امروہوی متوفی ۱۳۲۴ھ، ''مواہب الرحمٰن'' از امیر علی ملیح آبادی متوفی ۱۳۳۶ھ، ''خلاصۃ التفاسیر'' از فتح محمد تائب ۱۳۴۲ھ، ''تفسیر ثنائی'' از ابوالوفاء ثناء اللہ امرتسری متوفی ۱۳۶۱ھ، حواشی شبیری''

(برحاشیہ ترجمہ شیخ الھند) از شبیر احمد عثمانی متوفی ۱۳۷۰ھ، ''ترجمان القرآن'' از مولانا ابوالکلام آزاد، ''تفہیم القرآن'' از مولانا ابوالاعلی مودودی، ''تدبر قرآن'' از مولانا امین احسن اصلاحی، ''ترجمہ قرآن'' از ڈپٹی نذیر احمد، ''ترجمہ قرآن'' از مولانا فتح محمد جالندھری اور ''ترجمہ قرآن'' از مولانا محمد جونا گڑھی وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

ادھر گذشتہ چند برسوں میں جو تفسیری کام سامنے آئے ہیں، ان میں مولانا سعید احمد صاحب پالنپوری (استاد دارالعلوم دیوبند) کی تکمیل ہدایۃ القرآن، مولانا محمد تقی عثمانی کی توضیح القرآن، مولانا عبدالکریم پاریکھ کی تشریح القرآن، مولانا سید سلمان حسینی ندوی (عمید کلیۃ الدعوۃ والاعلام، دار العلوم ندوۃ العلماء) کی انتخاب تفسیر، آخری وحی اور تبویب القرآن، مولانا خالد سیف اللہ رحمانی کی آسان ترجمہ قرآن، مولانا حسان نعمانی ندوی کا توضیحی ترجمہ قرآن، مولانا بلال عبدالحی حسنی ندوی کی آسان معانی القرآن، مولانا محمد یونس پالنپوری کی ریاض القرآن بھی شامل ہیں، اسی طرح مولانا محمد یوسف متالا (برطانیہ) مولانا سید احتشام احمد ندوی اور مفتی سرور فاروقی اور دوسرے علماء کی بھی تفسیری خدمات ہیں۔

حال ہی میں دارالعلوم ندوۃ العلماء کے ایک فاضل مولانا حبیب الرحمٰن عبدالغفار ندوی نے قدیم وجدید معتبر ومستند تفسیر سے استفادہ کرتے ہوئے ''اشرف البیان فی توضیح معانی القرآن'' کے نام سے ایک اہم علمی ودینی کام کا آغاز کیا ہے جس کی پہلی جلد منظر پر آچکی ہے، اس میں انہوں نے ''بیان القرآن'' از مولانا اشرف علی تھانویؒ، ''زادالمسیر'' از علامہ ابن الجوزی، ''تفسیر ابن کثیر''، ''بیان القرآن'' از مولانا احمد علی لاہوری، ''خلاصۃ التفاسیر'' از مولانا فتح محمد تائب لکھنوی، ''ایسر التفاسیر'' از ابوبکر الجزائری، ''معارف القرآن'' از مولانا مفتی محمد شفیع عثمانی، ''لغات القرآن'' از مولانا عبدالرشید نعمانی اور ''التفسیر الموجز'' مطبوعہ مملکت عربیہ سعودیہ سے استفادہ کیا ہے۔

پرامن معاشرہ
قرآنی نقطۂ نظر

نیک اور صالح انسان کا قرآنی تصور

قرآن کریم پر علمی اعتبار سے بہت کام ہوا ہے، احکام، نظام، قانون، سابقہ قوموں کے عروج وزوال کی تفصیلات اور انسانی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر قرآن کریم کی روشنی میں اہل قلم نے مختلف زاویوں سے قلم اٹھایا ہے، موجودہ دور میں قرآن کریم کے علمی اعجاز پر کام ہوا جس طرح ماضی میں قرآن کریم کے اعجاز بیانی پر بڑا کام ہوا، لیکن انسان کی تربیت اور اسکے کردار وسلوک کی تشکیل، زندگی کو خوشگوار و پرامن طریقہ سے گزارنے اور پرامن انسانی معاشرہ کی تشکیل کے سلسلہ میں قرآن کریم میں جو تعلیمات اور ہدایات آئی ہیں، ان پر بہت کم کام ہوا، اس کی وجہ سے اسلام کے مخالفین یہ ثابت کرتے ہیں کہ قرآن کریم قتال وجہاد کی تعلیم دیتا ہے، جس کا قرآن کریم میں بہت محدود اور خاص حالات میں حکم ہے، قرآن کریم میں جیسا کہ اس کا دعوی ہے کہ وہ کتاب ہدایت اور بیان للناس ہے، انسانی زندگی کو پرامن طریقہ سے گزارنے کی بھرپور تعلیمات موجود ہے، اور بعض سورتیں تو انسانی حقوق اور امن عالم کے منشور کی حیثیت رکھتی ہیں، لہذا اس بات کی شدید ضرورت ہے کہ اس پہلو کی طرف توجہ کی جائے، تاکہ قرآن کریم کے سلسلہ میں جو پروپیگنڈہ کیا جارہا ہے اس کا مثبت جواب دیا جاسکے۔

قرآنی تصور کی رو سے مثالی انسان وہ نہیں جو صرف کسب معاش اور خواہشات نفس کی تکمیل کی

تگ ودو میں لگا رہے، بلکہ قرآن کریم کی نظر میں نیک انسان وہ مومن صالح ہے جو اپنے خالق کا حق شناس ہو، اپنی زندگی کو اپنے خالق و مالک کی مرضی ومنشا کے مطابق گزارے، اللہ کے بندوں کے درمیان ایک فرد صالح اور انسانی برادری میں ایک شریف رکن کی حیثیت سے رہے، پوری انسانیت کی فلاح و بہبود کے لیے کوشاں رہے، نہ کہ صرف اپنے مفاد کے لیے۔

اسلامی تربیت اور اس کا سرچشمہ

درحقیقت قرآن کریم کی نظر میں بہترین مثالی انسان وہ ہے جو دوسروں کی خاطر اپنے نفس کو قربان کردے، اس طرح مادی تربیت اور اسلامی تربیت میں بڑا نمایاں فرق ہے، مادی تربیت خودغرضی اور مفاد پرستی کو بڑھاوا دیتی ہے، جبکہ اسلامی تربیت انسان کو اپنائیت ،قربت، خلوص ومحبت، ایثار وقربانی اور ہمدردی وغمگساری کے زیور سے آراستہ کرتی ہے۔

اسلامی تربیت جس کا مصدر وماخذ قرآن کریم ہے ہر چیز کو اس کے مناسب مقام پر رکھتی ہے کہ انسانی سرگرمی کا کوئی پہلو مغلوب نہ ہونے پائے، اور جسم، عقل اور روح کے درمیان توازن برقرار رہے، انسان کو دوسرے کے لیے آئیڈیل بناتی ہے، اور کائنات میں اعلیٰ ترین مقام پر فائز ہونے کی ترغیب دلاتی ہے، اس اعتبار سے اسلامی تربیت انسان کے جسمانی، عقلی، شعوری، سماجی، ذوقی اور روحانی تمام پہلوؤں کو محیط ہے، اور اسلامی تربیت انسان کو متوجہ کرتی ہے کہ اس کی تمام سرگرمیاں ایک اعلیٰ مقصد پر مرکوز ہوں، اور وہ دنیا وآخرت میں اللہ کی خوشنودی اور رضا کے حصول کا ذریعہ ہو۔

اسلامی معاشرہ

اسلام جس کا منبع وسرچشمہ قرآن ہے، ایسے فرد اور سماج کی تشکیل کرتا ہے جس میں صرف خدائے وحدہ لاشریک کی پرستش ہو اور پھر اس کے ذریعہ سے اس میں اجتماعی زندگی کی خوبیاں :باہمی تعاون، یکجہتی، رواداری، ہمدردی، اخوت وبھائی چارہ اور الفت ومحبت کی جلوہ گری ہو، لیکن اس کے ساتھ ساتھ انسان کی ذاتی صلاحیتیں اور شخصی خصوصیات مجروح نہ ہوں۔

انسانی فطرت اور اسکے تقاضوں کی رعایت

کمانا اور جنسی خواہشات کو پورا کرنا انسانی فطرت کا تقاضہ ہے، لہذا انسان کی طبیعت بغیر کسی ترغیب وتلقین کے ان کی طرف مائل ہوتی ہے، قرآن کریم نے اس سلسلہ میں بھی سب سے الگ اور منفرد انداز اختیار کیا ہے، لہٰذا قرآن کریم نے حلال کمائی کی جگہیں اور طریقے اس طور پر متعین کیے ہیں کہ کسب معاش ذکر اللہ کی راہ میں رکاوٹ نہ بنے، کیونکہ انسان کی تخلیق کا اصل مقصد اللہ کی عبادت ہے ﴿وما خلقت الجن والإنس إلا ليعبدون﴾ [سورہ ذاریات:۵۶] (اور میں نے تو جن وانس کو پیدا ہی اس غرض سے کیا ہے کہ میری عبادت کیا کریں) قرآن ان لوگوں کا وصف بیان کرتے ہوئے کہتا ہے جنہوں نے عبادت اور تجارت کو تناسب کے ساتھ جمع کرلیا تھا۔ ﴿رجال لا تلهيهم تجارة ولا بيع عن ذكر الله﴾۔ [سورہ نور:۳۷] (ایسے لوگ جنہیں نہ تو تجارت غفلت میں ڈالتی ہے نہ خرید وفروخت اللہ کی یاد سے) ﴿فَإِذَا قُضِيَتِ الصَّلَاةُ فَانتَشِرُوا فِي الْأَرْضِ وَابْتَغُوا مِن فَضْلِ اللَّهِ وَاذْكُرُوا اللَّهَ كَثِيرًا لَّعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ﴾ [سورہ جمع:۱۰] (پھر جب نماز پوری ہو چکے تو زمین پر چلو اور اللہ کی روزی تلاش کرو اور اللہ کو بکثرت یاد کرتے رہو تا کہ تم فلاح پاؤ)۔

قرآن کریم نے کسب سے زیادہ انفاق پر زور دیا ہے، اس لیے کسب تو انسان کی فطرت میں داخل ہے، لہذا قرآن نے جگہ جگہ پر خرچ کرنے کے مواقع بیان کیے ہیں، اور افراد اور معاشروں کو مال کی محبت، استحصال اور خودغرضی سے پاک کرنے پر ابھارا ہے، اس لیے کہ یہی ہر بیماری کی جڑ ہے، اور مال کی محبت سماج کے بگاڑ اور طبقاتی استحصال کا بنیادی سبب ہے۔

قرآن کریم نے جس طرح انفاق پر زور دیا ہے، اسی طرح جنسی خواہشات میں اسراف سے ڈرایا بھی ہے، لہٰذا قرآن نے بار بار جنسی خواہشات میں اسراف اور انتہا پسندی کے خطرات سے آگاہ کیا ہے، حدود بیان کیے ہیں اور ان اسباب کو بیان کیا جن سے انسان اس وبا کا شکار ہوتا ہے۔

امن عالم کا اعلامیہ

سورہ اسراء میں بہت سی ایسی آیات ہیں جنہیں اخلاقیات، تربیت اور امن عالم کا اعلامیہ کہا جاسکتا ہے، ان آیات میں انسانی زندگی کے تمام پہلوؤں کو سمیٹ دیا گیا ہے، اور انسانی طبیعت میں کمزوریاں کیا ہیں اور ان کا علاج کیا ہے، سب کو بیان کر دیا گیا ہے۔

وَقَضَى رَبُّكَ أَلَّا تَعْبُدُوا إِلَّا إِيَّاهُ وَبِالْوَالِدَيْنِ إِحْسَاناً إِمَّا يَبْلُغَنَّ عِنْدَكَ الْكِبَرَ أَحَدُهُمَا أَوْ كِلَاهُمَا فَلَا تَقُل لَّهُمَا أُفٍّ وَلَا تَنْهَرْهُمَا وَقُل لَّهُمَا قَوْلاً كَرِيماً، وَاخْفِضْ لَهُمَا جَنَاحَ الذُّلِّ مِنَ الرَّحْمَةِ وَقُل رَّبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيَانِي صَغِيراً، رَّبُّكُمْ أَعْلَمُ بِمَا فِي نُفُوسِكُمْ إِن تَكُونُوا صَالِحِينَ فَإِنَّهُ كَانَ لِلْأَوَّابِينَ غَفُوراً، وَآتِ ذَا الْقُرْبَى حَقَّهُ وَالْمِسْكِينَ وَابْنَ السَّبِيلِ وَلَا تُبَذِّرْ تَبْذِيراً، إِنَّ الْمُبَذِّرِينَ كَانُوا إِخْوَانَ الشَّيَاطِينِ وَكَانَ الشَّيْطَانُ لِرَبِّهِ كَفُوراً، وَإِمَّا تُعْرِضَنَّ عَنْهُمُ ابْتِغَاء رَحْمَةٍ مِّن رَّبِّكَ تَرْجُوهَا فَقُل لَّهُمْ قَوْلاً مَّيْسُوراً، وَلَا تَجْعَلْ يَدَكَ مَغْلُولَةً إِلَى عُنُقِكَ وَلَا تَبْسُطْهَا كُلَّ الْبَسْطِ فَتَقْعُدَ مَلُوماً مَّحْسُوراً، إِنَّ رَبَّكَ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَن يَشَاءُ وَيَقْدِرُ إِنَّهُ كَانَ بِعِبَادِهِ خَبِيراً بَصِيراً، وَلَا تَقْتُلُوا أَوْلَادَكُمْ خَشْيَةَ إِمْلَاقٍ نَّحْنُ نَرْزُقُهُمْ وَإِيَّاكُمْ إِنَّ قَتْلَهُمْ كَانَ خِطْأً كَبِيراً، وَلَا تَقْرَبُوا الزِّنَى إِنَّهُ كَانَ فَاحِشَةً وَسَاءَ سَبِيلاً، وَلَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِي حَرَّمَ اللَّهُ إِلَّا بِالْحَقِّ وَمَن قُتِلَ مَظْلُوماً فَقَدْ جَعَلْنَا لِوَلِيِّهِ سُلْطَاناً فَلَا يُسْرِف فِّي الْقَتْلِ إِنَّهُ كَانَ مَنصُوراً، وَلَا تَقْرَبُوا مَالَ الْيَتِيمِ إِلَّا بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ حَتَّى يَبْلُغَ أَشُدَّهُ وَأَوْفُوا بِالْعَهْدِ إِنَّ الْعَهْدَ كَانَ مَسْؤُولاً، وَأَوْفُوا الْكَيْلَ إِذَا كِلْتُمْ وَزِنُوا بِالْقِسْطَاسِ الْمُسْتَقِيمِ

ذَلِكَ خَيْرٌ وَأَحْسَنُ تَأْوِيلًا، وَلَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهِ عِلْمٌ إِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ كُلُّ أُولٰئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْؤُولًا، وَلَا تَمْشِ فِي الْأَرْضِ مَرَحًا إِنَّكَ لَن تَخْرِقَ الْأَرْضَ وَلَن تَبْلُغَ الْجِبَالَ طُولًا، كُلُّ ذَٰلِكَ كَانَ سَيِّئُهُ عِندَ رَبِّكَ مَكْرُوهًا، ذَٰلِكَ مِمَّا أَوْحَىٰ إِلَيْكَ رَبُّكَ مِنَ الْحِكْمَةِ وَلَا تَجْعَلْ مَعَ اللَّهِ إِلَٰهًا آخَرَ فَتُلْقَىٰ فِي جَهَنَّمَ مَلُومًا مَّدْحُورًا (سورہ بنی اسرائیل، از آیت ۲۳ تا آیت ۳۹)

''اور تمہارے پروردگار نے فیصلہ کر دیا ہے کہ اس کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو، اور ماں باپ کے ساتھ بھلائی کرتے رہو، اگر ان میں سے ایک یا دونوں تمہارے سامنے بڑھاپے کو پہنچ جائیں، تو ان کو اف تک نہ کہو، اور نہ انہیں جھڑکنا، اور ان سے بات ادب کے ساتھ کرنا، اور عجز و نیاز سے ان کے ساتھ رہو، اور ان کے حق میں دعا کرو کہ اے پروردگار جیسا انہوں نے میری بچپن میں شفقت سے پرورش کی ہے تو بھی ان کے حال پر رحمت فرما، جو کچھ تمہارے دلوں میں ہے تمہارا پروردگار اس سے بخوبی واقف ہے، اگر تم نیک ہو گے تو وہ رجوع لانے والوں کو بخش دینے والا ہے، اور رشتہ داروں اور محتاجوں اور مسافروں کو ان کا حق ادا کرو، اور فضول خرچی سے مال نہ اڑاؤ، کہ فضول خرچی کرنے والے تو شیطان کے بھائی ہیں، اور شیطان اپنے پروردگار (کی نعمتوں) کا کفران کرنے والا (یعنی ناشکرا) ہے، اور اگر تم اپنے پروردگار کی رحمت (یعنی فراخ دستی) کے انتظار میں جس کی تمہیں امید ہو ان (مستحقین) کی طرف توجہ نہ کر سکو تو ان سے نرمی سے بات کہدیا کرو، اور اپنے ہاتھ کو نہ تو گردن سے بندھا ہوا (یعنی بہت تنگ) کر لو، (کہ کسی کو کچھ دو ہی نہیں) اور نہ ہی بالکل کھول دو (کہ سبھی کچھ دے ڈالو اور انجام یہ ہو کہ) ملامت زدہ اور ہاتھ باندھ کر

بیٹھ جاؤ، بیشک تمہارا پروردگار جس کی روزی چاہتا ہے فراخ کر دیتا ہے اور جس کی روزی چاہتا ہے تنگ کر دیتا ہے، وہ اپنے بندوں سے خبردار ہے، اور ان کو دیکھ رہا ہے، اور اپنی اولاد کو مفلسی کے خوف سے قتل نہ کرنا، کیونکہ ان کو اور تم کو ہم ہی رزق دیتے ہیں، کچھ شک نہیں کہ ان کا مار ڈالنا بڑا سخت گناہ ہے، اور زنا کے پاس بھی نہ جانا کہ وہ بے حیائی اور بری راہ ہے، اور جس جاندار کا مارنا خدا نے حرام کیا ہے اسے قتل نہ کرنا، مگر جائز طور پر (یعنی بہ فتوی شریعت) اور جو شخص ظلم سے قتل کیا جائے ہم نے اس کے وارث کو اختیار دیا ہے (کہ ظالم قاتل سے بدلہ لے) تو اس کو چاہئے کہ قتل (کے قصاص) میں زیادتی نہ کرے، وہ منصور اور فتحیاب ہے، اور یتیم کے مال کے پاس بھی نہ پھٹکنا، مگر ایسے طریقے سے کہ بہت بہتر ہو، یہاں تک وہ جوانی کو پہونچ جائے، اور عہد کو پورا کرو، کہ عہد کے بارے میں ضرور پرسش ہوگی، اور جب کوئی چیز ناپ کر دینے لگو تو پیمانہ پورا بھرا کرو، اور جب تول کر دو تو ترازو سیدھی رکھ کر تولا کرو، یہ بہت اچھی بات ہے، اور انجام کے لحاظ سے بھی بہت بہتر ہے، اور اے بندے جس چیز کا تجھے علم نہیں اس کے پیچھے نہ پڑ کہ کان اور آنکھ اور دل ان سب جوارح سے ضرور باز پرس ہوگی، اور زمین پر اکڑ کر اور تن کر مت چل کہ تو زمین کو پھاڑ تو نہیں ڈالے گا، اور نہ لمبا ہو کر پہاڑوں کی چوٹی تک پہنچ جائے گا، ان سب عادتوں کی برائی تیرے پروردگار کے نزدیک بہت ناپسند ہے، اے پیغمبر یہ ان ہدایتوں میں سے ہے جو خدا نے دانائی کی باتیں تمہاری طرف وحی کی ہیں، اور خدا کے ساتھ کوئی اور معبود نہ بنانا کہ ایسا کرنے سے ملامت زدہ اور درگاہ خدا سے راندہ بنا کر جہنم میں ڈال دئے جاؤ گے۔)۔

کرامت انسانی کی پاسداری

قرآن کریم اس بات کی تعلیم دیتا ہے کہ انسانیت کا احترام واکرام کیا جائے اور انسان کی صرف جسمانی حفاظت نہ کی جائے؛ بلکہ اس کے احساسات وجذبات کا بھی لحاظ رکھا جائے، قرآن کریم میں اس طرح کی تعلیمات بکثرت موجود ہیں

﴿وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْ آدَمَ وَحَمَلْنَاهُمْ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَرَزَقْنَاهُم مِّنَ الطَّيِّبَاتِ وَفَضَّلْنَاهُمْ عَلَى كَثِيْرٍ مِّمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِيْلاً﴾

[الإسراء:۷۰]۔

ہم نے بنی آدم کو عزت دی اور بحر وبر دونوں میں سوار کیا، اور عمدہ قسم کا رزق فراہم کیا، اور ہم نے ان کو اپنی بہت سی مخلوقات پر فضیلت دی۔

قرآن کریم حقوق انسانی اور کرامت انسانی کی پاسداری اتنی کرتا ہے کہ تمسخر، استہزا اور طعن وتشنیع کی بھی اجازت نہیں دیتا، قرآن کریم صراحت کے ساتھ اعلان کرتا ہے:۔

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْا لَا يَسْخَرْ قَوْمٌ مِّنْ قَوْمٍ عَسَى أَنْ يَّكُوْنُوْا خَيْرًا مِّنْهُمْ وَلَا نِسَآءٌ مِّنْ نِّسَآءٍ عَسَى أَنْ يَّكُنَّ خَيْرًا مِّنْهُنَّ وَلَا تَلْمِزُوْا أَنْفُسَكُمْ وَلَا تَنَابَزُوْا بِالْأَلْقَابِ، بِئْسَ الِاسْمُ الْفُسُوْقُ بَعْدَ الْإِيْمَانِ وَمَنْ لَّمْ يَتُبْ فَأُولٰئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ، يَا أَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوا اجْتَنِبُوْا كَثِيْرًا مِّنَ الظَّنِّ إِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ إِثْمٌ وَّلَا تَجَسَّسُوْا وَلَا يَغْتَبْ بَّعْضُكُمْ بَعْضًا أَيُحِبُّ أَحَدُكُمْ أَنْ يَّأْكُلَ لَحْمَ أَخِيْهِ مَيْتًا فَكَرِهْتُمُوْهُ، وَاتَّقُوا اللّٰهَ، إِنَّ اللّٰهَ تَوَّابٌ رَّحِيْمٌ﴾[سورہ حجرات:۱۱-۱۳]۔

(اے مومنو! کوئی قوم کسی قوم سے تمسخر نہ کرے، ممکن ہے کہ وہ لوگ ان سے بہتر ہوں، اور نہ عورتیں عورتوں سے تمسخر کریں، ممکن ہے کہ وہ ان سے اچھی ہوں، اور اپنے مومن بھائی کو عیب نہ لگاؤ اور نہ ایک دوسرے کا برا نام رکھو، ایمان لانے کے بعد برا نام رکھنا گناہ ہے، اور جو توبہ نہ کریں، وہ ظالم ہیں، اے

اہل ایمان! بہت گمان کرنے سے احتراز کرو، کہ بعض گمان گناہ ہیں، اور ایک دوسرے کے حال کا تجسس نہ کرو، اور نہ کوئی کسی کی غیبت کرے، کیا تم میں کوئی اس بات کو پسند کرے گا اپنے مرے ہوئے بھائی کا گوشت کھائے اس سے تو تم ضرور نفرت کرو گے (تو غیبت نہ کرو) اور خدا کا خوف رکھو، بے شک خدا توبہ قبول کرنے والا مہربان ہے۔

احترام انسانیت

قرآن کریم میں انسانوں کے حقوق کی پاسداری اور بغیر کسی تفریق وامتیاز کے انسان کا احترام مرکزی موضوع کی حیثیت رکھتا ہے اور قرآن کریم قومیت اور عصبیت کی بنیاد پر انسانوں کے درمیان تفریق کرنے سے روکتا ہے، چنانچہ ارشاد فرمایا گیا ہے:

﴿يَاۤ أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّأُنْثٰى وَجَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّقَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ أَتْقٰكُمْ، إِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ خَبِيْرٌ﴾ [سورہ حجرات:۱۲]

اے لوگوں ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا ہے اور ہم نے تم کو مختلف کنبوں اور خاندانوں میں بانٹ دیا تاکہ ایک دوسرے کو پہچان سکو، اللہ کے نزدیک تم میں سب سے زیادہ مکرم وہ ہے جو تم میں سب سے زیادہ پرہیز گار ہے، بیشک اللہ جاننے والا خبر رکھنے والا ہے۔

اسلام نے کرامتِ انسانی کو مجروح کرنے والے اسباب ووسائل پر ہی قدغن لگادی ہے اور ان پر پابندی عاید کردی ہے، قرآن کریم میں اللہ تعالی ارشاد فرماتا ہے

﴿مَن قَتَلَ نَفْساً بِغَيْرِ نَفْسٍ أَوْ فَسَادٍ فِي الْأَرْضِ فَكَأَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيْعاً وَمَنْ أَحْيَاهَا فَكَأَنَّمَا أَحْيَا النَّاسَ جَمِيْعا﴾ (المائدۃ:۳۲)۔

جس نے کسی کو ناحق قتل کیا یا زمین میں فساد مچایا تو گویا کہ اس نے پوری انسانیت ہی کو قتل کر دیا اور جس نے کسی نفس کو زندگی بخشی تو گویا کہ اس نے پوری انسانیت کو زندگی عطا کی۔

مذاہب کا احترام

اس تکریم میں عقیدہ کا بھی احترام شامل ہے؛ اس لیے کہ اسلام نے دوسرے مذاہب کے ماننے والوں کو برا بھلا کہنے، ان کے ساتھ بدسلوکی کرنے اور دوسرے مذاہب کی مقدس ومحترم ہستیوں کے سلسلے میں نازیبا الفاظ استعمال کرنے سے منع کیا ہے، قرآن مجید میں فرمایا گیا ہے:

﴿وَلَا تَسُبُّوا الَّذِينَ يَدْعُونَ مِن دُونِ اللَّهِ فَيَسُبُّوا اللَّهَ عَدْوًا بِغَيْرِ عِلْمٍ كَذَٰلِكَ زَيَّنَّا لِكُلِّ أُمَّةٍ عَمَلَهُمْ ثُمَّ إِلَىٰ رَبِّهِم مَّرْجِعُهُمْ فَيُنَبِّئُهُم بِمَا كَانُوا يَعْمَلُونَ﴾ (الأنعام:۱۰۸)۔

جو لوگ خدا کو چھوڑ کر دوسروں کو پکارتے ہیں ان کو برا بھلا مت کہو، ورنہ وہ نادانی ودشمنی میں خدا کو برا بھلا کہیں گے، اسی طرح ہم نے ہر قوم کے عمل کو مزین کر دیا ہے، پھر سب کے سب اپنے پروردگار کے پاس لوٹ آئیں گے، پھر اللہ تعالی ان کو بتلادے گا جو وہ کیا کرتے تھے۔

اخلاق کی تعلیم

اسی طرح قرآن کریم نے تواضع وعاجزی، صبر وبرداشت، حلم وبردباری، ملنساری وخندہ پیشانی اور عام زندگی میں اخلاق برتنے کی تعلیم دی ہے اور غرور وتکبر، نخوت وپندار اور بڑائی کے اظہار سے منع کیا ہے، قرآن کہتا ہے

﴿يَا بُنَيَّ أَقِمِ الصَّلَاةَ وَأْمُرْ بِالْمَعْرُوفِ وَانْهَ عَنِ الْمُنكَرِ وَاصْبِرْ عَلَىٰ مَا أَصَابَكَ إِنَّ ذَٰلِكَ مِنْ عَزْمِ الْأُمُورِ، وَلَا تُصَعِّرْ خَدَّكَ

لِلنَّاسِ وَلَا تَمْشِ فِي الْأَرْضِ مَرَحاً إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ فَخُورٍ، وَاقْصِدْ فِي مَشْيِكَ وَاغْضُضْ مِن صَوْتِكَ إِنَّ أَنكَرَ الْأَصْوَاتِ لَصَوْتُ الْحَمِيرِ ﴾ [سورہ لقمان:۱۷-۱۹]

اے میرے بیٹے نماز قائم رکھو، بھلائی کی تلقین کرتے رہو اور برائی سے روکتے رہو اور تمہیں جو تکلیف پہنچے اس پر صبر کرتے رہو، یقیناً یہ بڑی ہمت کے کام ہیں اور لوگوں کے لیے گال مت پھلاؤ اور نہ زمین میں اکڑ کر چلو، بلاشبہ کسی اکڑنے والے اترانے والے کو اللہ پسند نہیں کرتا، اور درمیانی چال چلو اور آواز دھیمی رکھو، یقیناً بدترین آواز گدھوں کی آواز ہے۔

ایک دوسری جگہ قرآن کہتا ہے

﴿وَعِبَادُ الرَّحْمَنِ الَّذِينَ يَمْشُونَ عَلَى الْأَرْضِ هَوْناً وَإِذَا خَاطَبَهُمُ الْجَاهِلُونَ قَالُوا سَلَاماً ﴾[سورہ فرقان:۶۳]

اور رحمٰن کے خاص بندے وہ ہیں جو زمین پر دبے پاؤں چلتے ہیں اور نادان لوگ ان کے منہ لگتے ہیں تو وہ صاحب سلامت کر لیتے ہیں۔

قرآن نے سیاست کے باب میں بھی عدل وانصاف اختیار کرنے کی تاکید کی ہے حتی کہ بدسلوکی کرنے والے کے ساتھ بھی عدل کرنے کا حکم دیا ہے:

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُونُوا قَوَّامِينَ لِلَّهِ شُهَدَاءَ بِالْقِسْطِ وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَآنُ قَوْمٍ عَلَى أَلَّا تَعْدِلُوا اعْدِلُوا هُوَ أَقْرَبُ لِلتَّقْوَى وَاتَّقُوا اللَّهَ إِنَّ اللَّهَ خَبِيرٌ بِمَا تَعْمَلُونَ﴾ (المائدۃ:۸)۔

اے ایمان والو! اللہ کے لئے پوری پابندی کرنے والے انصاف کیساتھ شہادت ادا کرنے والے رہو اور کسی قوم کی دشمنی تم کو انصاف کی ڈگر سے ہٹا نہ دے، عدل وانصاف سے کام لو، یہی تقوی کے زیادہ قریب ہے، اللہ سے ڈرو، اللہ تعالی کو تمہارے سب اعمال کی خبر ہے!

مومن کی شان

یہ ہے پرامن معاشرہ کے متعلق قرآن کریم کی واضح اور مفصل تعلیمات کا خلاصہ، مومنین عقیدۂ توحید کے معاملہ میں بالکل فولاد ہیں، لیکن جب انکے اخلاق ومعاملات پر نظر ڈالی جائے تو ریشم کی طرح نرم ہوتے ہیں، ایک صحیح العقیدہ مومن کی شان ہی یہی ہے کہ وہ عقیدۂ توحید میں فولاد کی طرح سخت اور معاملات واخلاق میں ریشم کی طرح نرم ہو، اس لیے کہ مومن کا عقیدہ اسے اللہ کے احکامات بجالانے کی دعوت دیتا ہے، اور گناہوں کے ارتکاب سے باز رکھتا ہے، جب کسی معاشرہ میں فولاد کی سی سختی اور ریشم کی سی نرمی پیدا ہوجائے تو وہ ایک بہترین معاشرہ ہوتا ہے اور جب معاشرہ میں اجتماعی اور شخصی حقوق کے مابین توازن قائم ہوجائے تو یہ معاشرہ ممتاز معاشرہ بن جاتا ہے۔

اور جن لوگوں نے عصبیت سے بلند ہوکر صاف دل سے قرآن کا مطالعہ کیا انہوں نے قرآن کریم کی ان مثالی تعلیمات کا اعتراف کیا اور ان میں سے بہت سے لوگوں نے اسلام قبول کرلیا۔

اس کے برعکس جب ہم اس معاشرہ پر نظر ڈالتے ہیں جس کی تشکیل تہذیب حاضر کی روشنی میں ہوئی ہے تو انتہا پسندی کے علاوہ کچھ نظر نہیں آتا، وہ ایک انتہا پسند معاشرہ ہے، نہ اسکی ایسی خصوصیات ہیں جو اس کی پہچان بن سکیں اور نہ ہی اس کے امتیازات ہیں جو اس کی شان ہوں، اس کی عمارت ہی غلط بنیادوں پر قائم ہے، اس کی اساس ہی تناقضات کا مجموعہ ہے، اس کا کوئی مرکزی عنصر اور محور نہیں سوائے خودغرضی اور لذت نفس کے۔

کلام رسول صلی اللہ علیہ وسلم
کی ادبی وفنی خصوصیات اور اس کا تربیتی پہلو

کلام رسولؐ کا ادبی مقام ومرتبہ اور تربیتی پہلو

عربی نثر میں زبان وبیان کی قوت ورعنائی، ادبی حلاوت ولطافت، فصاحت وبلاغت، جمال تعبیر، حسن ادا اور اسلوب کی دلکشی وتأثیر میں قرآن کریم کے بعد حدیث نبوی کا مقام ومرتبہ ہے، قرآن کریم اللہ تعالی کا بھیجا ہوا الٰہی اور معجزانہ کلام ہے، جسے نہ تو شاعری کہا جاسکتا ہے اور نہ ہی نثر، اور کلام رسول ﷺ انسانی کلام میں سب سے اعلی وارفع اور فصیح ترین کلام ہے۔

بہترین کلام

عربی زبان وادب کے بے مثال رمز شناس ابوعثمان بن بحر الجاحظ بہترین کلام کی پہچان بتاتے ہوئے کہتا ہے:۔

''بہترین کلام وہ ہے جس کا اختصار تفصیل سے بے نیاز کردے، جس کے معانی ومفہوم الفاظ سے پھوٹے پڑتے ہوں، ایسا لگتا ہے جیسے اللہ رب العزت نے عظمت وشکوہ کا ایک جامۂ دلفریب پہنا کر اپنے حبیب (صلی اللہ علیہ وسلم) کو حکمت ودانش کے نورانی ہالے میں لے لیا تھا، جس پر کہنے والے کی پاکیزگی، احساس ذمہ داری اور خلوص نیت سایہ فگن ہے، چنانچہ معنی اگر بلند اور لفظ بلیغ وبے آورد نیز ہر طرح کے ابہام وتصنع سے پاک ہے، تو دلوں پر اس کا وہی اثر ہوگا جو ابرِ کرم کا زرخیز مٹی پر ہوا کرتا ہے، زبان سے ادا ہونے والے الفاظ جس حد تک ان شرائط پر پورے اتریں گے اور بولنے والا بولتے وقت جس درجہ ان کی رعایت رکھے گا، اسی درجہ براہ راست وہ دل کے تاروں کو

چھوسکیں گے، ان کے مفہوم ومعانی کو غیبی تائید وتاثیر ملے گی "از دل خیزد و بر دل ریزد" کا سماں پیدا ہوگا اور سرکش سے سرکش ذہن اور بڑے سے بڑا سنگ دل ان لفظوں کے نہ صرف آہنگ؛ بلکہ ان کی آہٹ پر ہی موم ہوکر رہے گا"۔

قرآنی ادب کا اثر اور موضوعات کا تنوع

کلام رسولؐ پر قرآنی ادب کا اثر نمایاں ہے اور قرآنی ادب کے رنگ وآہنگ میں اسی طرح ڈوبا ہوا ہے جس طرح جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق وعادات اور آپؐ کی سیرت وکردار قرآن کریم کا پرتو ہے، حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کا بیان ہے کہ "آپؐ اخلاق میں قرآن کا مجسم نمونہ تھے" قرآنی مدرسہ میں تربیت اور تعلیم کے اثر سے آپ کے کلام میں قرآنی ادب کے تمام رنگ پائے جاتے ہیں، قرآن کا حکایتی اسلوب وانداز، تاریخی اور تشریعی انداز، واقعہ نگاری، جذبات نگاری، تصویر کشی، منظر کشی، احساسات وجذبات کی ترجمانی، یہ تمام رنگ وآہنگ آپ کے کلام میں پائے جاتے ہیں، اسی طرح قرآن کریم کی جو ادبی اور فنی خصوصیات ہیں وہ بھی آپ کے کلام میں ملتی ہیں، جیسے کلام مرسل، کلام مقید، الفاظ کی موسیقیت، صوتی تناغم، کلام کی سلاست وروانی، کلام کی عظمت وشکوہ، انذار وتبشیر اور نفسیات کی ترجمانی وغیرہ۔

مخاطبین کے فکری اور نفسیاتی حالات کے اعتبار سے اور زندگی اور موضوعات کے تنوع کے لحاظ سے حدیث نبوی کے موضوعات میں تنوع پایا جاتا ہے، اور اسی طرح حدیث نبوی میں نفس انسانی پر اثر ڈالنے اور معانی ومفاہیم کو ذہنوں اور دلوں میں بٹھانے کے لیے تأثیر واقناع کے تمام ذرائع اختیار کیے گئے ہیں۔

افصح العرب

کلام رسولؐ کی خصوصیت یہ ہے کہ تمام معجزانہ امتیاز کے باوجود ایک سادہ لوح سامع اسے سن کر سمجھتا ہے، وہ خود بھی اس کی تقلید کرسکتا ہے، عبداللہ ابن المقفع کے نزدیک

بلاغت اس کا نام ہے اور سہل ممتنع اسی کو کہتے ہیں۔

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے ایک مرتبہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے فرمایا:

میں نے عربوں میں چکر لگایا اور فصحاء کے کلام کو سنا؛ لیکن آپ سے فصیح کسی کو نہیں پایا، تو کس نے آپ کو ادب کی تعلیم دی''۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''میری تربیت میرے رب نے کی اور بہترین تربیت کی۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے

میں تمام عرب میں سب سے زیادہ فصیح ہوں، اس لیے کہ میرا تعلق قریش سے ہے اور میں بنی سعد بن بکر میں پروان چڑھا۔

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی گفتگو تم لوگوں کی طرح لگاتار جلدی جلدی نہیں ہوتی تھی؛ بلکہ صاف صاف ہر مضمون دوسرے مضمون سے ممتاز ہوتا تھا، پاس بیٹھنے والے اچھی طرح سے ذہن نشیں کر لیتے تھے۔

حضرت ہند بن ابی ہالہؓ کہتے ہیں کہ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہر وقت آخرت کی فکر اور امور آخرت کی سوچ میں رہتے، اس کا ایک تسلسل قائم تھا کہ کسی وقت آپ کو چین نہیں ہوتا تھا، اکثر طویل سکوت فرماتے، بلا ضرورت کلام نہ فرماتے، گفتگو کا آغاز فرماتے تو دہن مبارک سے اچھی طرح الفاظ ادا فرماتے اور اسی طرح اختتام فرماتے، آپ کی گفتگو اور بیان بہت صاف، واضح اور دوٹوک ہوتا، نہ اس میں غیر ضروری طوالت ہوتی نہ زیادہ اختصار۔ (شمائل ترمذی)

ادب نبوی کی بلاغت وتاثیر اور اساطین زبان وادب کا اعتراف

ادب نبوی اور کلام رسولؐ کو بیان کرتے ہوئے متأخرین نے لکھا ہے کہ آپؐ کا

کلام الہامی اور موفق من اللہ ہے، اور آپؐ کے سوا کسی کے بس میں نہیں کہ آپؐ جیسا کلام پیش کرے، وہ انسانی کلام میں سب سے زیادہ حسین و دلکش اور سب سے زیادہ فصیح و بلیغ ہے، کلام عرب میں اس کی کوئی نظیر نہیں ملتی۔

کلام رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی توصیف کرتے ہوئے جاحظ اپنی معرکہ آراء کتاب ''البیان والتبیین'' میں رقم طراز ہے۔:

''وہ ایسا کلام ہے جس کے حروف کی تعداد کم، مفہوم و معانی کی مقدار فزوں تر، تصنع سے پاک، تکلف سے بری، تفصیل کی ضرورت ہو تو مفصل، اختصار کافی ہو تو مختصر، نہ متروک و نامانوس الفاظ، نہ لوچ پوچ اور سوقیانہ تعبیر، میراث دانش کی تقسیم، خموشی فکر و نظر کا پیغام، دہن مبارک سے ادا ہونے والا ہر جملہ تجلیات ربانی کے ہالے میں، تائید الٰہی کی متانت، توفیق ایزدی کی سلاست، یہی وہ کلام حبیب ہے جس کا خمیر اللہ کی عطا کردہ محبت و قبولیت سے اٹھا ہے، ایک طرف اس میں شکوہ و جلال، دوسری طرف شیرینی و جمال، کوئی سنے تو فہم و فراست کو جلا ملے، دیکھے تو الفاظ بس گنے چنے، نہ آپ کو اس کی ضرورت کہ اپنے جملوں کو دہرائیں، نہ سننے والے کو اس کی حاجت کہ

سمجھے نہ کوئی بات مکرر کہے بغیر

نہ کوئی لفظ رواروی میں زبان نبوت سے نکلا، نہ کبھی کوئی قدم بہکا، نہ کوئی دلیل کمزور و بے اثر ثابت ہوئی، نہ کوئی حریف آپ کے سامنے ٹک سکتا، نہ کوئی خطیب آپ کو لاجواب کر پاتا، آپ کی مختصر مگر جامع گفتگو کے آگے طول طویل خطابت ہیچ اور شعلہ بار خطیب سرافگندہ، کبھی حریف کی زباں بندی کے جتن نہ کرتے، البتہ اس کی عقل و فہم کے مطابق اسے سمجھانے کی کوشش فرماتے، صرف سچے اور پکے دلائل سے کام لیتے، راستی و حق گوئی میں ہی کامیابی تلاش کرتے، نہ پرفریب بحث و مباحثہ کرتے، نہ چرب زبانی سے کام لیتے، نہ

تذلیل وتضحیک، نہ ہجو وتمسخر، گفتگو میں نہ سست روی نہ جلد بازی، نہ بے ضرورت تفصیل، نہ بے موقع اختصار۔

آپ سے پہلے بنی نوع انسان کے لیے ایسا کلام ناشنیدہ ہی رہا تھا جس کا نفع عام اور بھرپور، جس کا ہر لفظ صدق ووفا کا عنوان، جو توازن لفظی ومعنوی کا شاہکار، حسن ظاہر اور جمال باطن کا مرقع، رعنائی وزیبائی اس پر صدقے، گہرائی وگیرائی اس پر نثار، تاثیر وروانی کا پیکر جمیل، مفہوم ومعنی صوت وادا کے شانہ بہ شانہ، گوہر مقصود مانند مہر عالم تاب۔ یہ ہے نبوت کی شیریں ذہنی اور کلام حبیب بہ زبان حبیب۔ صلی اللہ علیہ وسلم۔ (البیان والتبیین، ص: ۲/۷-۸، دار الکتاب العلمیۃ بیروت، لبنان ترجمہ ماخوذ از کاروان ادب، شمارہ دوم، ص: ۷۷، جولائی تا ستمبر ۱۹۹۴ء)

محمد بن سلام جمحی کہتے ہیں کہ یونس بن حبیب نے کہا:

کلام رسولؐ میں جو جواہر پارے اور شاہکار ادبی نمونے ملتے ہیں وہ کسی اور کے کلام میں نہیں ملتے۔

ابن عبدربہ کہتے ہیں:

اللہ تعالیٰ نے اپنے نبیؐ کو تمام اچھے آداب کی تعلیم دی اور مکارم اخلاق سے مزین فرمایا، اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اپنے ہاتھ کو اپنی گردن سے باندھ کر نہ رکھو، اور نہ ہی اسے پورا کھول کر رکھو، ورنہ ملامت زدہ اور ملول ہو کر بیٹھ جاؤ گے، اللہ نے آپ کو بخل سے بھی روکا اور اسراف اور تبذیر سے بھی اور اس میں اعتدال اور میانہ روی اختیار کرنے کا حکم دیا، ارشاد ربانی ہے: اور جو خرچ کرتے وقت بھی نہ تو اسراف کرتے ہیں، نہ بخیلی، بلکہ ان دونوں کے درمیان معتدل طریقہ پر خرچ کرتے ہیں۔ (سورہ فرقان: ۶۷)

اللہ تعالیٰ نے اپنے نبیؐ کے لیے اپنی کتاب محکم میں مکارم اخلاق کو تین لفظوں مین جمع کر دیا ہے، ﴿خذ العفو وامر بالعرف وأعرض عن

الجاهلين ﴾[اعراف:۱۰۰] چنانچہ عفواور درگزر میں صلہ رحمی اور ظالم سے چشم پوشی کی تعلیم ہے، اور امر بالعرف میں تقوی الٰہی، حرام سے اجتناب، دروغ گوئی اور کذب بیانی سے دوری کی تلقین ہے اور اعراض عن الجاھلین میں کم عقلوں اور بیوقوفوں سے نہ الجھنے کی تعلیم ہے، اس کے بعد اللہ تعالی نے نرمی اور شفقت کی تعلیم دی ہے، ﴿واخفض جناحك لمن اتبعك من المؤمنين ﴾[شعراء:۲۱۵] ﴿ولو كنت فظا غليظ القلب لانفضوا من حولك ﴾[آل عمران:۱۵۹] ﴿ ولا تستوى الحسنة ولا السيئة ادفع بالتي هي أحسن فإذا الذي بينك وبينه عداوة كأنه ولي حميم ، وما يلقاها إلا الذين صبروا وما يلقاها إلا ذو حظ عظيم ﴾ [فصلت:۳۴-۳۵] اور جب ان آداب کی تعلیم وتلقین مکمل ہوگئی تو ارشاد ہوا ﴿لقد جاء كم رسول من أنفسكم عزيز عليه ما عنتم حريص عليكم بالمؤمنين رء وف رحيم فإن تولوا فقل حسبي الله لا إله إلا هو عليه توكلت وهو رب العرش العظيم﴾[توبہ:۱۲۸-۱۲۹]

قاضی عیاض لکھتے ہیں کہ:

''زبان کی فصاحت اور کلام کی بلاغت میں آپؐ کا درجہ بہت بلند تھا، اس کے ساتھ ہی سلاست وجودت طبع، انوکھے طرز اور ایجاز میں بھی آپؐ بے مثال تھے، الفاظ کی فصاحت ومعانی کی صحت میں آپ حدِّ کمال پر فائز تھے، آپ کی گفتگو میں تکلف اور لفظوں میں تنافر نہیں ہوتا تھا، آپ کو جوامع الکلم اور بدائع الحکم دے گئے تھے اور آپ عرب کی مختلف زبانوں سے واقف تھے اور ہر قوم وقبیلہ سے اس کی زبان میں گفتگو کرتے اور سب سے ممتاز اور فائق رہتے''۔

(شفاء قاضی عیاض مع شرح نسیم الریاض للخفاجی، ج۱ر۴۷۷-۴۷۹)

ابوالعباس المبرد (متوفی ۲۸۵ھ) نے اپنی کتاب ''الکامل'' میں جگہ جگہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کو فصاحت وبلاغت کے عمدہ نمونے کے طور پر پیش کیا ہے۔

اندلس کا ممتاز عرب ادیب ابوحیان توحیدی قرآن کے بعد حدیث کی اہمیت کا اس طرح اعتراف کرتا ہے کہ:

''اور دوسری چیز سنتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہے جو ہمارے لیے کھلا راستہ، روشن ستارہ، قائدِ ناصح، علم بلند اور منزلِ مقصود ہے اور جو زبان و بیان کی غایت اور حجت و برہان کی انتہاء ہے، اور معرکہ کے وقت پناہ گاہ اور سب کے لیے ہادی و رہنما ہے''۔ (البصائر والذخائر، ج ۸/۱، نقلاً عن التصویر الفنی فی الحدیث النبوی للصباغ، ص:۲۱)

شریف رضی (متوفی ۴۰۶ھ) نے ''المجازات النبویة'' میں تین سو ساٹھ (۳۶۰) حدیثوں کی اہمیت سے تفصیلی بحث کی ہے، ابن رشیق (متوفی ۴۶۳ھ) کلام نبوی کی ادبی حیثیت و اہمیت ذکر کرنے کے بعد لکھتا ہے کہ:

''اور اس طرح فصاحت کی مثالیں آپ کے کلام میں بہت ہیں اور آپ سے بڑھ کر فصاحت و ایجاز کا حق دار بھی کون ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم خود فرماتے ہیں کہ مجھے جوامع الکلم عطا ہوئے ہیں، اس لیے یہ کلام فصاحت و ایجاز کی انتہا ہے''۔ (العمدہ لابن رشیق، ج ۱/۲۵۳-۲۵۵)

عبدالقاہر الجرجانی (متوفی ۴۷۱ھ) نے اپنی کتاب ''اسرار البلاغة'' میں کلام نبوی کی بلاغت و فصاحت کی متعدد مثالیں پیش کی ہیں، ابن الاثیر (متوفی ۶۲۲ھ) نے ''المثل السائر'' میں جوامع الکلم کی ایک مستقل فصل قائم کی ہے، ابوہلال العسکری (متوفی ۳۹۵ھ) ''الصناعتین'' میں ادبی لطافت و حلاوت اور بلاغت کی شاہکار حدیثوں کو ذکر کرنے کے بعد اس کے ایجاز کی داد دیتے ہوئے کہتے ہیں:

''کلام نبوی کے معانی اس کے الفاظ سے کہیں زائد ہوتے ہیں، اگر آپ اس کی تصدیق چاہتے ہیں تو انہیں تحلیل کرکے دوسری ترکیب قائم کریں تو وہ ان الفاظ نبویہ سے کئی گنا زیادہ الفاظ پر مبنی ہوگی''۔ (ص:۱۷۸۔ ترجمہ ماخوذ از کاروان ادب، شمارہ دوم، جولائی تا ستمبر ۱۹۹۴ء)

مصطفیٰ صادق رافعی لکھتے ہیں کہ:

''آپ صرف ان معانی اور مضامین کو بیان کرتے جو نبوت کے الہامات، حکمت کا نچوڑ اور انتہائی عاقلانہ امور ہوتے، جو کچھ کہتے اس میں بلاغت، پختگی اور اعتدال کی خوبی ہوتی''۔ (اعجاز القرآن، ص:۲۹۶)

ایک دوسری جگہ کہتے ہیں کہ:

''ہم نے نادر روزگار بلاغت نبوی کو اس طرح پایا کہ اس کا ہر ایک لفظ حقیقت کا لفظ ہے، نہ کہ زبان کا لفظ ہے، اس میں حقائق کی ترجمانی کی گئی ہے، یہ حقائق اپنے معیار کے اعتبار سے اپنے الفاظ کا انتخاب کر لیتے ہیں، اس کی وجہ سے کلام ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس میں حقیقت خود اپنا اظہار کرتی ہے اور سچی بات ایک مرتبہ کہی جاتی ہے اور ایک ہی بار میں اس کی لغوی کیفیت سے اس کے واضح معانی اس طرح سامنے آجاتے ہیں جیسے اس میں نور کی کرن ہو''۔ (وحی القلم، ج ۳/۱۹، ترجمہ ماخوذ از کاروان ادب، شمارہ دوم، جولائی تا ستمبر ۱۹۹۴ء)۔

الہامی اسلوب

مذکورہ بالا بیانات سے واضح ہوتا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا اسلوب الہامی اسلوب ہے، آپ کے ادب اور اخلاق کی تشکیل وتعمیر قرآنی درسگاہ میں ہوئی ہے، اور یہ ایسا بے نظیر اسلوب ہے کہ کوئی دوسرا انسانی اسلوب اس کی ہمسری نہیں کر سکتا۔

ادب نبویؐ سے متعلق اہم تصنیفات ومعلومات

عہد جدید میں رافعی کے علاوہ عباس محمود عقاد (متوفی ۱۹۶۴ء) نے ''عبقرية محمد''میں، ڈاکٹر احمد حسن زیات نے اپنی کتاب ''تاريخ الادب العربی''اور ''وحی الرسالة''میں، عبدالرحمٰن عزام نے ''بطل الأبطال''میں، مصطفیٰ الزرقاء نے ''في الحديث النبوي''میں، ڈاکٹر بکری شیخ امین نے ''أدب الحديث النبوي'' میں، ڈاکٹر عزالدین السید نے ''الحديث النبوي''میں، ڈاکٹر عبدالمجید محمود نے ''أمثال الحديث''

میں، محمد بن لطفی الصباغ نے ''الحدیث النبوي: مصطلحہ، بلاغتہ، کتبہ'' اور ''التصویر الفني في الحدیث النبوي'' میں کلام نبوی کی ادبی وفنی خصوصیات، ادبی مقام ومرتبہ، فصاحت وبلاغت اور ادبی ومعنوی حیثیت واہمیت کے متعدد پہلوؤں کو تفصیلی ومدلل انداز میں پیش کیا ہے، صباغ نے یہ اعتراف کیا ہے کہ:

''حدیث نبوی ایک اعلی درجہ کا متن ہے اور ادب عالی کے میدان میں بلاغت وفصاحت اور حسن بیان میں صرف قرآن ہی اس سے فائق ہے''۔

(التصویر الفنی فی الحدیث النبوی، ص:۲۰)

اردو میں بھی اس موضوع پر وقیع کام ہوا ہے جس میں سب سے ممتاز پروفیسر ظہور احمد اظہر کا کام ہے، جنہوں نے ''فصاحت نبوی'' کے عنوان سے ایک فاضلانہ کتاب لکھی ہے۔ عالمی رابطہ ادب اسلامی نے حدیث نبوی کے متعدد پہلوؤں پر حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی کی صدارت میں کئی سیمینار منعقد کیے جن میں حدیث نبوی کے ادبی، بلاغتی، فنی اور تربیتی پہلو پر اہم مقالات پیش کیے گئے اور پھر وہ اس کے اردو ترجمان ''کاروان ادب'' میں شائع ہوئے، شمارہ دوم، جولائی تا ستمبر ۱۹۹۴ء، شمارہ سوم، اکتوبر تا دسمبر ۱۹۹۴ء، اور رابطہ کا انتخاب کردہ مجموعہ ''مقالات حمد ومناجات ودعاء'' (انتخاب کردہ از مقالات مذاکرۂ منعقدہ ۱۶-۱۸/ ربیع الاول ۱۴۲۱ھ مطابق ۷-۹/ اکتوبر ۱۹۹۰ء) قابل ذکر ہیں۔

حدیث کے مطالعہ کے مختلف پہلو ہیں، اور ہر پہلو پر اہل قلم نے روشنی ڈالی ہے، ایک لغوی پہلو ہے، حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں متعدد الفاظ ہیں جن سے عربی زبان میں اضافہ ہوا، دوسرا ادبی پہلو ہے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم افصح العرب ہیں، اس لیے حدیث میں ایسی تعبیرات ہیں جن سے عربی ادب میں اضافہ ہوا، اس کے علاوہ تشریعی پہلو ہے جو احکام سے متعلق ہے، ان سارے پہلوؤں پر کام ہوا ہے، ایک تعلیمی پہلو ہے اس پر شیخ عبدالفتاح ابو غدہ کی کتاب ''الرسول المعلم'' بہت اہمیت رکھتی ہے، ایک تربیتی پہلو ہے، جس میں تربیت میں نفسیات کی رعایت رکھی گئی ہے، اس پر بھی ایک اہم کتاب ''النبی المربی'' ہے۔

سیرت وکردار کی میزان

حدیث نبوی کا ایک اہم پہلو یہ بھی ہے کہ حدیث سیرت نبوی کا آئینہ ہے، مسلمانوں کی مستند زندگی کا معیار اور میزان ہے، احتساب امت کا ایک طاقتور ذریعہ اور مصلحین ومجددین امت کی ایک تربیت گاہ ہے۔ مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ حدیث نبوی کے اس پہلو پر روشنی ڈالتے ہوئے رقم طراز ہیں:۔

"حدیث نبوی ایک ایسی صحیح میزان ہے جس میں ہر دور کے مصلحین ومجددین اس امت کے اعمال وعقائد، رجحانات وخیالات کو تول سکتے ہیں، اور امت کے طویل تاریخی وعالمی سفر میں پیش آنے والے تغیرات وانحرافات سے واقف ہوسکتے ہیں، اخلاق واعمال میں کامل اعتدال وتوازن اس وقت تک پیدا نہیں ہوسکتا جب تک قرآن وحدیث کو بیک وقت سامنے نہ رکھا جائے، اگر حدیث نبوی کا وہ ذخیرہ نہ ہوتا جو معتدل، کامل ومتوازن زندگی کی صحیح نمائندگی کرتا ہے اور وہ حکیمانہ نبوی تعلیمات نہ ہوتیں اور یہ احکام نہ ہوتے جن کی پابندی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسلامی معاشرہ سے کرائی، تو یہ امت افراط وتفریط کا شکار ہوکر رہ جاتی اور اس کا توازن برقرار نہ رہتا اور وہ عملی مثال موجود نہ رہتی جس کی اقتداء کرنے کی خدا تعالی نے اپنے اس فرمان میں ترغیب دی ہے ﴿لقد کان لکم في رسول اللہ أسوۃ حسنۃ﴾ (یقیناً تمہارے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات میں اسوہ حسنہ ہے) اور یہ فرما کر آپ کے اتباع کی دعوت دی ہے ﴿قل إن کنتم تحبون اللہ فاتبعوني یحببکم اللہ ویغفر لکم ذنوبکم﴾ (آپ کہہ دیجیے کہ اگر تمہیں اللہ سے محبت ہے تو میری اتباع کرو، اللہ تم سے محبت کرے گا اور تمہارے گناہ معاف کردے گا) یہ ایک ایسا عملی نمونہ ہے جس کی انسان کو ضرورت ہے اور جس سے وہ زندگی، قوت اور اعتماد حاصل کرسکتا ہے اور یہ اطمینان کرسکتا ہے کہ دینی احکام کا زندگی پر نفاذ نہ صرف آسان، بلکہ ایک امر واقعہ ہے۔

حدیث نبوی زندگی، قوت اور اثر انگیزی سے بھرپور ہے، اور ہمیشہ اصلاح وتجدید کے کام، فساد اور خرابیوں اور بدعتوں کے خلاف صف آرا اور برسر جنگ ہونے اور معاشرہ کا احتساب کرنے پر ابھارتی رہی ہے، اور اس کے اثر سے ہر دور اور ہر ملک میں ایسے افراد پیدا ہوتے رہے جنہوں نے اصلاح وتجدید کا جھنڈا بلند کیا، کفن بردوش ہوکر میدان میں آئے اور بدعتوں اور خرافات اور جاہلی عادتوں سے کھلی جنگ کی اور دین خالص اور صحیح اسلام کی دعوت دی، اسی لیے حدیث نبوی امت اسلامیہ کے لیے ایک ناگزیر حقیقت اور اس کے وجود کے لیے ایک لازمی شرط ہے، اس کی حفاظت، ترتیب وتدوین، حفظ اور نشر واشاعت کے بغیر امت کا یہ دینی وذہنی، عملی واخلاقی دوام وتسلسل برقرار نہیں رہ سکتا تھا۔

سنت نبوی اور حدیث نبوی کے مجموعے ہمیشہ اصلاح وتجدید اور امت اسلامیہ میں صحیح اسلامی فکر کا سرچشمہ رہے ہیں، انہی سے اصلاح کا بیڑا اٹھانے والوں نے تاریخ کے مختلف دوروں میں صحیح علم دین اور خالص فکر اسلامی اخذ کیا، انہی احادیث سے انہوں نے استدلال کیا اور دین واصلاح کی دعوت میں وہی ان کی سند اور ان کا ہتھیار اور سپر تھی، بدعتوں، فتنوں اور شر وفساد سے جنگ ومقابلہ کے معاملہ میں وہی قوت محرکہ ودافعہ تھی، آج جو بھی مسلمانوں کو دین خالص اور اسلام کامل کی طرف آنے کی پھر دعوت دینا چاہتا ہے اور ان کے اور نبوی زندگی اور کامل اسوہ کے درمیان تعلق استوار کرنے کا ارادہ رکھتا ہے، اور جس کو بھی ضرورت اور زمانہ کے تغیرات نئے احکام کے استنباط کرنے پر مجبور کرتے ہیں وہ اس سرچشمہ سے بے نیاز نہیں ہوسکتا''۔ (اسلامی مزاج وماحول کی تشکیل وحفاظت میں حدیث نبوی کا بنیادی کردار، از: مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی، ص: ۲۹-۳۱، مجلس تحقیقات ونشریات اسلام لکھنؤ)

حدیث نبویؐ میں منظر کشی کے چند نمونے

حدیث شریف کے موضوعات میں بڑا تنوع اور وسعت ہے، احکام وشریعت کا بیان، اسلامی تعلیمات وہدایات اور قرآنی نصوص کی شرح وتفصیل، اسلامی تعلیمات کی تفسیر وضاحت میں قصوں، کہاوتوں اور تمثیلات کا استعمال، ترغیب وترہیب، انذار وتبشیر، جنت اور دوزخ کے احوال اور اچھے اور برے اعمال کی جزاوسزا کا بیان، سابقہ قوموں کے حالات واقعات کا تذکرہ، آنے والی نسلوں کا ذکر، قیامت اور اس کی علامات کا بیان، عبادات، اخلاقیات، معاملات کا تذکرہ، انسانی فطرت اوراس کے متنوع حالات کا ذکر اور انسان کے مختلف نمونوں کا وصف وبیان وغیرہ۔ ذیل میں حدیث نبوی کی چند مثالیں دی جارہی ہیں، جن میں انسانی نمونوں، نوع انسانی کی مختلف طبیعتوں، مزاجوں، انسانی فطرت اور انسانی نفسیات کو ایسے حکایتی پیرائے بیان میں پیش کیا گیا ہے کہ محسوسات اور غیر مرئی چیزیں متحرک اور مجسم شکل میں سامنے نظر آتی ہیں۔

با اخلاق انسان اور بد اخلاق انسان کی مثال

قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه وسلم : ألا أنبئكم بشر الناس؟ قالوا: بلى يا رسول اللّٰه، قال: من أكل وحده، ومنع رفده، وجلد عبده، ثم قال: ألا أنبئكم بشر من ذلك؟ قالوا: بلى يا رسول اللّٰه، قال: من لا يقبل عثرة ولا يقبل معذرة،ثم قال: ألا أنبئكم بشر من ذلك؟ قالوا: بلى يا رسول اللّٰه،قال: من يبغض الناس ويبغضونه۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کیا میں تم لوگوں کو بتاؤں کہ لوگوں میں سب سے برا کون ہے؟ لوگوں نے کہا کیوں نہیں یارسول اللہ! آپ نے فرمایا: یہ وہ شخص ہے جو تنہا کھائے اور دوسروں کو نہ دے اور اپنے غلام کو کوڑے لگائے، پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہا: کیا تم لوگوں کو اس سے بدترین شخص نہ بتاؤں؟ لوگوں نے کہا کیوں نہیں یارسول اللہ! آپ نے فرمایا: یہ وہ شخص ہے جو دوسرے کی لغزشوں کو نہ مانے اور کسی کی معذرت کو قبول نہ کرے، پھر فرمایا: جانتے ہو اس سے بھی بدترین شخص کون ہے؟ لوگوں نے کہا نہیں یارسول اللہ! آپ نے فرمایا: یہ وہ شخص ہے جو لوگوں سے بغض رکھے اور لوگ اس سے بغض رکھیں۔

قال رسول اللّٰہ صلی اللہ علیہ وسلم للأنصار: إنکم لتکثرون عند الفزع و تقلون عند الطمع۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انصار کو مخاطب کرتے ہوئے کہا: خطرات اور قربانیوں کے موقعوں پر تمہاری تعداد زیادہ ہوتی ہے، منافع اور فوائد کے موقعوں پر تمہاری تعداد کم ہوتی ہے۔ (البیان والتبیین للجاحظ، والکامل للمبرد)

اس کلام نبوی میں جو جمالِ ادبی اور بلاغت پائی جاتی اسے عربی زبان وادب کے رمز شناس اور نکتہ رس جاحظ نے ادب نبوی کا شہ پارہ قرار دیا ہے اور مبرد نے جس کا شمار عربی زبان وادب کے اصول اربعہ میں میں ہوتا ہے اسی حدیث سے اپنی کتاب ''الکامل'' کا آغاز کیا ہے۔

ایک دوسری حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ

ألا أخبرکم بأحبِّکم إلیَّ، وأقربکم منی مجلساً یوم القیامه، أحاسنُکم أخلاقاً، المؤطئون أکتافاً الذین یألفون ویؤلفون، ألا أخبرکم بأبغضکم إلیَّ، وأبعدکم منی مجلساً یوم القیامة الثرثارون المتشدقون المتفیهقون۔

قیامت کے دن مجھے سب سے زیادہ پسندیدہ اور سب سے زیادہ مجھ سے قریب وہ ہوں گے جو اچھے اخلاق والے ہیں اور مجھے سب سے زیادہ نا پسندیدہ اور سب سے زیادہ مجھ سے دور ہوں گے وہ جو زیادہ باتونی، چرب زبان اور تصنع کرنے والے متکبر ہوں گے۔ (ترمذی)

''المؤدلقون أكتافاً'' اور ''الثرثارون المتشدقون المتفيهقون'' میں انسان کی ہیئت کی تصویر کشی کی گئی ہے، پہلے جملہ میں تواضع، عاجزی، انکساری اور نرمی کو بیان کیا گیا ہے، اور دوسرے جملہ میں انسان کی چرب زبانی، تکبر، غرور اور گھمنڈ کو بیان کیا گیا ہے۔

ریاکاری اور حب جاہ کی مثال

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے تھے کہ قیامت کے دن سب سے پہلے شہید کو بلایا جائے گا اور اس سے ایک ایک نعمت گنوائی جائے گی، وہ ساری نعمتوں کا اقرار کرے گا، پھر کہا جائے گا: ان نعمتوں کا کیا شکر ادا کیا؟ وہ کہے گا: پروردگار میں نے تیری راہ میں جنگ کی، یہاں تک کہ شہید ہو گیا، اللہ تعالیٰ فرمائے گا: تو جھوٹا ہے، تو نے تو صرف اس لیے جنگ کی تھی کہ میں بہادر کہلاؤں، سو تو بہادر مشہور ہو چکا، اب مجھ سے کیا لے گا، پھر اس کو منہ کے بل گھسیٹنے کا حکم دیا جائے گا اور وہ آگ میں ڈال دیا جائے گا، پھر عالم اور قاری کو بلایا جائے گا اور اللہ تعالیٰ اس سے بھی اپنی نعمتوں کا اقرار لے گا اور وہ اقرار کریں گے، پھر ان سے کہا جائے گا کہ ان نعمتوں کا شکر ادا کیا؟ وہ کہے گا: اے میرے رب میں نے تیرا علم سیکھا اور سکھایا، قرآن شریف پڑھا اور پڑھایا، اللہ تعالیٰ فرمائے گا: تم جھوٹ بولتے ہو، تم نے علم محض اس لیے سیکھا تھا کہ عالم اور قاری کہلاؤ، عزت و جاہ حاصل ہو، سو دنیا میں تمہاری شہرت ہو چکی، تم عالم اور قاری مشہور ہو گئے، تمہارا مطلب حاصل ہو گیا، اب مجھ سے کیا لو گے، پھر اس کو چہرے کے بل گھسیٹنے کا حکم

ہوگا اور وہ دوزخ میں ڈال دیا جائے گا، پھر امیروں کو طلب کیا جائیگا، ان کے سامنے ان کی دولت پیش کی جائے گی، وہ اس کا اقرار کریں گے، پھر پوچھا جائے گا کہ تم نے اس مال کو کہاں صرف کیا، وہ کہیں گے پروردگار میں نے یہ مال تیری خوشی کے لیے تیری راہ میں خرچ کیا اللہ تعالی فرمائے گا تم جھوٹے ہو، تم نے مال اسی جگہ صرف کیا جہاں تمہاری خواہش تھی اور سخی مشہور ہونے کا امکان تھا، سو تم سخی مشہور ہو گئے، تمہارا مطلب پورا ہو گیا، پھر اس کو بھی چہرہ کے بل گھسیٹ کر دوزخ میں ڈالنے کا حکم ہو جائے گا''۔ (مسلم)

واقعہ نگاری اور نفسیاتی حالت کی منظر کشی

حدیث نبوی میں ایک پہاڑی غار کی منظر کشی کی گئی ہے جس میں چٹان کے کھسکنے سے تین شخص بند ہو گئے تھے، انھیں یہ یقین ہو گیا تھا کہ وہ اب موت کے منھ میں آ گئے ہیں، اللہ کے سوا کوئی بچا نہیں سکتا، اس کے بعد تینوں نے اپنے اپنے نیک اعمال کی بنیاد پر اللہ سے فریاد کی اور اللہ کے فضل و کرم سے چٹان غار کے منھ سے ہٹ گئی اور وہ بسلامت باہر آ گئے۔

حضرت ابو عبد الرحمٰن عبد اللہ بن عمر بن خطابؓ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے فرماتے سنا ہے کہ

تم سے پہلے تین آدمی کہیں روانہ ہوئے، راستہ میں شام ہو گئی، انہوں نے ایک غار میں پناہ لی، جب اس میں داخل ہوئے تو ایک پتھر گر پڑا اور غار کا دروازہ بند ہو گیا، ان لوگوں نے کہا: اس پتھر سے کوئی نجات نہیں دے سکتا، ہاں یہ کہ اللہ تعالی کو اپنے کسی عمل کو یاد دلاتے ہوئے پکارو۔

ان میں سے ایک نے کہا: اے اللہ تعالی! میرے ماں باپ بوڑھے تھے اور میں ان سے پہلے اپنی بیوی اور بچوں کو دودھ نہیں پلاتا تھا، ایک دن میں چارے کی تلاش میں دور تک چلا گیا اور راہ میں مجھ کو شام ہو گئی، جب گھر پلٹا تو

ان کو سوتا پایا، میں نے برا سمجھا کہ ان کو بے آرام کروں یا ان سے پہلے بیوی اور بچوں کو دودھ پلاؤں، پیالہ میرے ہاتھ میں تھا اور میں ان کے جاگنے کے انتظار میں کھڑا رہا، یہاں تک کہ صبح نمودار ہوگئی اور بچے میرے پاؤں پر لوٹ رہے تھے، میں نے ان کو دودھ پلایا۔ اے اللہ! اگر یہ کام میں نے تیری خوشی کے لیے کیا ہے، تو اس پتھر کو ہم سے دور کر، پس پتھر تھوڑا ہٹ گیا۔

دوسرے نے کہا: اے اللہ میری ایک چچازاد بہن تھی، وہ مجھکو بہت محبوب تھی، ایک روایت میں ہے کہ میں اس کو اتنا چاہتا تھا کہ جیسے کسی مرد کو عورت سے محبت ہوسکتی ہے، ایک دن میں نے بلایا، اس نے انکار کیا، یہاں تک قحط سے پریشان ہوکر وہ میرے پاس آئی، میں نے اس کو ایک سو بیس (۱۲۰) دینار اس شرط پر دیے کہ وہ مجھ سے تخلیہ (تنہائی) میں ملے، وہ راضی ہوگئی، جب میں نے ارادہ کیا تو اس نے کہا: اللہ سے ڈرو، میں یہ سن کر باز رہا، حالانکہ وہ مجھے انتہائی محبوب تھی، پھر میں نے اس سے روپیہ بھی واپس نہیں لیا، اے اللہ! اگر میں نے یہ کام تیری رضا کی خواہش میں کیا ہے تو ہمیں اس مصیبت سے رہائی عطا فرما، تو پتھر کھسک گیا؛ مگر اتنا نہیں کہ نکل سکے۔

تیسرے نے کہا: اے اللہ! میں نے کچھ مزدور کام کے لیے بلائے اور ان کو پوری مزدوری دی سوا ایک آدمی کے کہ وہ چلا گیا تھا، میں نے اس کی مزدوری سے تجارت کی، کچھ عرصہ میں تجارت خوب نفع لائی، ایک دن وہ آیا اور کہا: اللہ کے بندے میری مزدوری دے، میں نے کہا: یہ جتنی چیزیں تم دیکھ رہے ہو، اونٹ، گائے، بکری، غلام سب تمہارے ہیں اور تمہاری مزدوری سے ہیں، کہا: کیوں مجھ سے مذاق کرتے ہو، میں نے کہا: میں مذاق نہیں کرتا، یہ حقیقت ہے، تو وہ سب لے کر چلا گیا، اے اللہ! اگر میری یہ بات تجھے پسند آئی ہو تو ہم کو اس تنگی سے نجات فرما، پس وہ پتھر ہٹ گیا اور نکل گئے"۔ (متفق علیہ)

شکر اور ناشکری کی مثال

مذکورہ بالا حدیث میں تین شکر گزار شخصوں کا بیان تھا، جنہوں نے اپنے نیک اعمال کی دہائی دی تو ان کی پریشانی دور ہوگئی، درج ذیل حدیث میں تین ایسے لوگوں کا تذکرہ ہے جن کو نعمت دے کر آزمایا گیا، ان میں سے دو نے ناشکری کی تو ان کی نعمت چھین لی گئی اور ایک نے اللہ کا شکر ادا کیا تو اس کی نعمت باقی رہی۔

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے کہ بنی اسرائیل کے زمانہ میں تین آدمی تھے، ایک کوڑھی، دوسرا گنجا، تیسرا اندھا، اللہ تعالی نے ان کی آزمائش کا ارادہ کیا، ان کے پاس ایک فرشتہ بھیجا، پہلے سفید داغ والے کے پاس آیا اور کہا: تجھے کون سی چیز محبوب ہے؟۔ اس نے کہا: اچھا رنگ اور اچھی جلد اور مجھ سے یہ بیماری دور ہو جائے جس کی وجہ سے لوگ نفرت کرتے ہیں، فرشتہ نے اس کے بدن پر ہاتھ پھیرا تو اچھی جلد اور اچھا رنگ نصیب ہوا، کہا: تجھے کون سا مال پسند ہے؟، کہا: اونٹ یا گائے (راوی کو شک ہے) فرشتہ نے ایک گابھن اونٹنی دی اور برکت کی دعا کی، پھر گنجے کے پاس آیا اور کہا تو کیا چاہتا ہے؟ کہا: میں چاہتا ہوں کہ میرا گنج دور ہو جائے جس کے سبب سے لوگ مجھ سے نفرت کرتے ہیں اور اچھے بال کی خواہش ہے، فرشتہ نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا تو اس کا گنج دور ہو گیا اور اچھے بال نکل آئے، کہا: کون سا مال تجھے مرغوب ہے؟ کہا: گائے، پس ایک گابھن گائے اس کو دی اور برکت کی دعا کی، پھر اندھے کے پاس آیا اور کہا: تیری کیا خواہش ہے؟ کہا: میں یہ چاہتا ہوں کہ اللہ تعالی میری آنکھوں کو بینائی عطا فرمائے تا کہ میں لوگوں کو دیکھ سکوں، فرشتہ نے اس کی آنکھوں پر ہاتھ پھیرا تو اس کی بصارت پلٹ آئی، کہا: تم کو کون سا مال پسند ہے؟ کہا: بکری، پس اس کو ایک گابھن بکری دی، کچھ عرصہ بعد ان تینوں کے جانوروں سے میدان بھر گئے۔

چند دن کے بعد فرشتہ اسی صورت اور ہیئت میں کوڑھی کے پاس آیا اور کہا کہ میں غریب آدمی ہوں، میری راہ کھوٹی ہوئی، میں آج کے دن نہیں پہنچ سکتا، تجھے اللہ کا واسطہ دے کر سوال کرتا ہوں جس نے تجھ کو اچھی جلد اور اچھی کھال عنایت کی، مجھ کو راستہ کا خرچ دے تا کہ میں پہنچ جاؤں، سفید داغ والے نے کہا: مجھ پر بہت حقوق ہیں، فرشتہ بولا: غالبا میں تجھکو پہچانتا ہوں، تو فقیر تھا اور مبروص بھی، لوگ تجھ سے نفرت کرتے تھے، اللہ نے تجھ پر احسان کیا، کہا: واہ، یہ دولت میرے گھر میں باپ دادوں سے چلی آتی ہے، فرشتہ نے کہا: اگر تو جھوٹا ہے تو خدا تجھ کو ویسا ہی کر دے، پھر گنجے کے پاس آیا اور ویسا ہی سوال کیا جیسے کوڑھی سے کیا تھا، گنجے نے وہی جواب دیا، فرشتہ نے کہا: اگر تو جھوٹا ہے تو خدا تجھ کو ویسا ہی کر دے۔ پھر اندھے کے پاس آیا اور کہا: میں غریب آدمی ہوں، میں اپنے وطن نہیں پہنچ سکتا، تجھ کو اللہ کا واسطہ دیتا ہوں، جس نے تجھ کو بصارت عطا فرمائی، مجھ کو راستہ کا خرچ دے تا کہ میں پہنچ جاؤں، اس نے کہا: بیشک میں اندھا تھا، اللہ تعالی نے میری آنکھوں کو روشن کیا، تیرا جتنا جی چاہے لے اور جتنا چاہے چھوڑ، خدا کی قسم میں آج کے دن تجھ سے نہ جھگڑوں گا، جس چیز کو تو خدا کے نام پر لے لے گا، فرشتہ نے کہا: تیرا مال تجھے مبارک ہو، اللہ نے محض آزمائش کی تھی، پس اللہ تجھ سے راضی ہوا اور تیرے ان دونوں ساتھیوں سے ناراض ہوا۔ (متفق علیہ)

ماں کی گود میں بات کرنے والے تین بچوں کا قصہ

حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

گود میں تین ہی نے گفتگو کی، حضرت عیسیٰ بن مریم علیہما السلام اور اس بچہ نے جس کو جریج کی طرف منسوب کرتے تھے اور جریج کا قصہ یہ ہے کہ وہ ایک عابد آدمی تھے، انہوں نے ایک عبادت گاہ بنا رکھی تھی، اس میں رہا کرتے تھے، ایک دن ان کی ماں آئیں، وہ نماز پڑھ رہے تھے، انہوں نے ان کو آواز

دی، جریج نے کہا: اے پروردگار کیا کروں، ماں کو جواب دوں یا نماز پڑھوں؟ وہ نماز پڑھتے ہی رہے، ماں چلی گئیں، دوسرے روز پھر آئیں اور آواز دی، وہ پھر نماز میں تھے، انہوں نے کہا: اے پروردگار ماں اور نماز کا مقابلہ ہے اور پھر نماز پڑھتے رہے، ماں نے کہا: اے اللہ اس وقت تک اس کو نہ مار جب تک یہ بری عورتوں کا منہ نہ دیکھ لے، ایک دن بنی اسرائیل جریج اور ان کی عبادت کا ذکر کر رہے تھے، ایک عورت نے کہا (جس کی خوبصورتی ضرب المثل تھی) کہ اگر تم کہو تو میں ان کو فتنہ میں ڈال دوں؟ وہ ان کے پاس آئی، انہوں نے التفات نہ کیا، وہ ایک چرواہے کے پاس گئی جو جریج کی عبادت گاہ میں رات کو رہا کرتا تھا، وہ ملوث ہوا، جب اس کے لڑکا ہوا، تو کہا: یہ جریج کا لڑکا ہے، لوگ جریج کے پاس آئے اور ان کو اس عبادت گاہ پر سے اتارا اور اس کو منہدم کر دیا اور ان کو مارنا شروع کیا، انہوں نے کہا: آخر کیا بات ہے، لوگوں نے کہا: تم نے گناہ کیا، انہوں نے کہا: بچہ کہاں ہے؟ لوگ اس کو لائے، انہوں نے کہا: اچھا مجھے نماز پڑھ لینے دو، انہوں نے نماز پڑھی، نماز پڑھنے کے بعد بچہ کے پاس آئے اور اس کے پیٹ میں انگلی ماری اور کہا: اے بچے تیرا باپ کون ہے؟ بچہ نے کہا: فلانا چرواہا ہے، بس پھر کیا تھا، لوگوں جریج کے ہاتھ پاؤں چومنے شروع کیے اور تبرکاً ان پر ہاتھ پھیرنے لگے اور کہنے لگے: ہم تمہاری عبادت گاہ سونے کی تعمیر کریں گے، وہ بولے: نہیں، جیسے پہلے تھی ویسے ہی بنا دو۔

تیسرا بچہ جو گود میں بولا، ایک عورت کا بچہ تھا، ماں بچہ کو دودھ پلا رہی تھی کہ ایک سوار بڑے تزک و احتشام کے ساتھ ادھر سے گزرا، ماں نے اس کو دیکھ کر دعا کی کہ خدایا میرا بچہ بھی اسی شان و شوکت کا ہو، بچہ دودھ چھوڑ کر سوار کو دیکھنے لگا اور کہنے لگا کہ اے پروردگار مجھ کو اس جیسا نہ ہونے دینا، یہ کہہ کر بچہ پھر دودھ پینے لگا، کچھ دیر کے بعد منظر سامنے آیا کہ لوگ ایک لونڈی کو طرح طرح کے جرائم کا

الزام دیتے ہوئے اور اس کو بلاوجہ مارتے ہوئے ادھر سے گزرے، لونڈی صرف ''حسبی اللہ ونعم الوکیل'' کہتی رہی اور ''رضا بالقضاء'' پر اس کا عمل رہا، بچہ کی ماں نے یہ دیکھ کر دعا کی کہ پروردگار میرا بچہ ایسا نہ ہو، بچہ دودھ چھوڑ کر اس کو بھی دیکھنے لگا اور کہنے لگا: اے اللہ! مجھکو اسی لونڈی کی طرح بنانا، اب ماں بیٹے میں اس امر میں سوال جواب شروع ہوا، ماں نے کہا: میں نے سوار اور اس کی شان کو دیکھ کر جب دعا کی کہ میرا بچہ ایسا ہی ہو تو تو نے کہا: خدا مجھ کو اس جیسا نہ بنائے، اس لونڈی کو جو ذلیل ورسوا کی جارہی تھی، میں نے دیکھ کر جب کہا کہ خدا تجھ کو ایسی حالت میں مبتلا نہ کرے تو تو نے کہا: کہ خدا مجھ کو ایسا ہی کرے، بچہ نے جواب دیا کہ اے ماں! سوار ایک نہایت ہی متکبر اور ظالم شخص تھا، اس لیے میں نے اس کی حالت اپنے لیے ناپسند کی اور وہ لونڈی جس کو تم ذلیل سمجھی تھیں، حقیقت میں مظلومہ تھی، اس لیے میں نے اس کے درجہ کی تمنا کی۔ (متفق علیہ)

ان تین قصوں کے علاوہ حدیث نبویؐ میں اور بھی بہت سے قصے ہیں جن میں انسانی نمونوں کو پیش کیا گیا ہے اور ہر قصہ میں تین نمونے ہیں جن کا کسی نہ کسی انسان کی زندگی سے تعلق ہے، اور انسان کے لیے عبرت ونصیحت اور رہنمائی کا سامان ہے اور یہ نصیحت ایسے حکایتی انداز میں پیش کی گئی ہے جس سے انسان کی فطری اور نفسیاتی حالت کی ترجمانی ہوتی ہے، اور انسان کے شکر واحسان مندی، ناشکری واحسان ناشناسی، انابت الی اللہ، خطرات اور مصائب میں اللہ کی طرف رجوع اور اس سے نصرت ومدد کا سوال، الزام تراشی اور دوسروں سے بدگمانی میں جلد بازی، ماں بیٹے کے تعلقات اور اس کے دیگر احساسات وجذبات کی عکاسی ملتی ہے، اور یہ تمام حالات وجذبات عام فہم، دلکش ودلآویز اور شیریں رواں اسلوب میں بیان کیے گئے ہیں، جنہیں انسانوں کے تمام طبقات سمجھتے ہیں حتی کہ چھوٹے بچے بھی ان قصوں کو دلچسپی اور شوق سے سنتے اور لطف اندوز ہوتے ہیں۔

اسراء ومعراج کے واقعہ میں بھی انسانی نمونوں کا تذکرہ ہے، جنت ودوزخ کے حالات

کی منظر کشی ہے۔ محسوسات کو مشاہدات کی شکل میں پیش کیا گیا ہے، انسانوں کے ان اعمال کو جن پر جزا یا سزا کا ترتب ہوتا ہے، ایسے الفاظ میں پیش کیا گیا جن سے پورا منظر نگاہوں کے سامنے گھومنے لگتا ہے، اگر قصہ میں منظر کشی، کردار نگاری اور نفسیاتی حالات اور تاثرات واحساسات کی تصویر کشی نہ ہو تو قصہ تاثیر سے خالی اور پھیکا ہوتا ہے، اگر چہ اس میں واقعہ کا بیان ہو، لیکن وہ خشک اور بے مزہ ہوتا ہے، بلکہ صرف خشک تاریخی معلومات پر مشتمل ہوتا ہے، حضرت ابو ہریرہؓ کلام رسول ؐ میں اسی فنی خوبی اور ادبی حسن و جمال کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتے ہیں:۔

فكأني أنظر إلى رسول الله صلى الله عليه وسلم وهو يحكي ارتضاعه بأصبعه السبابة في فيه فجعل يمصها

''میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھ رہا ہوں اور وہ اپنے منہ میں انگلی رکھ کر دودھ پینے کو بیان کر رہے ہیں''

حدیث رسولؐ میں انسانی نفسیات وحالات اور محسوسات کو ایسے اسلوب میں بیان کیا گیا ہے کہ وہ مجسم شکل میں سامنے آجاتے ہیں، اس کی مثال اسماء بنت یزید انصاریؓ کی روایت میں ملتی ہے، وہ کہتی ہیں۔

قال النبي صلى الله عليه وسلم: ألا أخبركم بخياركم؟ قالوا: بلى، قال: فخياركم الذين إذا رؤوا ذكر الله تعالى، ألا أخبركم بشراركم؟ قالوا: بلى، قال: فشراركم المفسدون بين الأحبة، المشاؤن بالنميمة، الباغوان البُرآء العنت۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کیا میں تمہیں بتاؤں کہ تم میں سب سے بہتر کون ہے؟ لوگوں نے کہا: کیوں نہیں، آپ نے فرمایا: تم میں سب سے بہتر وہ لوگ ہیں جنہیں دیکھ کر خدا یاد آتا ہے، اور تم میں سب بدترین وہ لوگ ہیں جو دوستوں کے تعلقات میں بگاڑ پیدا کرتے ہیں، لگائی بجھائی کرتے ہیں اور بے گناہوں اور بے قصوروں کو مصائب میں الجھا دیتے ہیں۔ (مسند امام احمد)

ایک اور حدیث میں انسان کے دو نمونے بیان کیے گئے ہیں، ایک وہ شخص جس کا دل رحمت وشفقت سے لبریز ہو اور دوسرا وہ شخص جس کا دل اس سے خالی ہو، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ:

''ایک دیہاتی آپ کے پاس آیا اور کہا: کیا تم اپنے بچوں کو بوسہ دیتے ہو، پیار کرتے ہو، ہم تو ایسا نہیں کرتے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کہا: میں کیا کرسکتا ہوں اگر اللہ نے تمہارے دل سے جذبۂ رحمت نکال لیا ہے''۔ (بخاری)

پڑوسی اور مہمان کا اکرام

حضرت ابوشریح عدویؓ سے روایت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

جو اللہ اور آخرت پر ایمان رکھتا ہو وہ اپنے پڑوسی کا اکرام کرے اور جو اللہ اور آخرت پر ایمان رکھتا ہو وہ اپنے مہمان کا اکرام واحترام کرے، اور جو اللہ اور آخرت پر ایمان رکھتا ہو وہ بھلی بات کہے یا پھر خاموش رہے۔ (بخاری)

حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے روایت کی جاتی ہے کہ:

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: وہ مومن نہیں جو خود آسودہ رہے اور اس کا پڑوسی بھوکا رہے۔

انسانی طبیعتیں اور مزاج مختلف ہوتے ہیں، کسی کا میانہ روی اور کم خرچ کرنے کا مزاج ہوتا ہے، چنانچہ وہ صرف اہل وعیال پر خرچ کرتا، کوئی زیادہ بولنے کا عادی ہوتا ہے، کوئی خاموش مزاج ہوتا ہے، یہ مختلف رجحانات اور مزاج انسانوں میں پائے جاتے ہیں، اجتماعی زندگی پر ان سب کا اثر پڑتا ہے اور اجتماعی زندگی انفرادی زندگی سے بنتی ہے، احادیث میں انسانی نفسیات اور انسانی فطرت کی بھرپور رعایت ملتی ہے، انسانی طبیعتوں کا فرق بھی بیان کرتی ہیں اور ان طبیعتوں میں جو کج روی ہے اس کا علاج بھی کرتی ہیں۔

نعت گوئی

نعت گوئی کی ابتداء

نعت گوئی، حب رسول اور شوقِ زیارتِ مدینہ کے احساسات کی ترجمانی کا مؤثر ذریعہ ہے، یہ صنف عہد رسولؐ ہی سے شروع ہوگئی تھی، اور حضرت حسان بن ثابت انصاری رضی اللہ عنہ کے قصائد جن کو ''شاعر رسول'' کے نام سے یاد کیا جاتا ہے اور کعب بن زہیر رضی اللہ عنہ کا ''قصیدۂ بردہ'' جو ان کی نجات اور حیات کا ذریعہ بنا اور عربی ادب میں اس کو امتیازی حیثیت حاصل ہوئی، اپنی ادبی افادیت اور مقبولیت کی وجہ سے ہمیشہ عربی زبان وادب کے نصاب میں شامل رہے، ان کے علاوہ عہد نبوی میں خلفاء راشدین اور دیگر صحابۂ کرام نے بھی حضور اقدس ﷺ کے اوصافِ پرعظمت اور انسانیت پر آپ ﷺ کے احسانات اور آپؐ کے اخلاق کریمانہ اور جمال ظاہری کو موزوں الفاظ میں بیان کیا ہے، بعض نے آپ ﷺ سے اپنی وابستگی اور وارفتگیٔ شوق کو پر درد اور پرسوز لہجہ میں نظم کیا ہے، اور وصال کے بعد درد فراق کا ذکر کیا، اس میں حضرت حسان بن ثابت انصاریؓ کا ایک بہت مؤثر قصیدہ ہے۔ وہ قصیدہ دالیہ میں کہتے ہیں:

بطيبة رسم للرسول ومعهد
منير وقد تعفو الرسوم وتهمد
ولا تمحي الآيات من دار حرمة
بها منبر الهادي الذي كان يصعد

(طیبہ میں رسول اللہ ﷺ کے نشانات ہیں اور آپ کا بصیرت افروز مرکز ہے، دنیا

کے نشانات مٹتے رہتے ہیں اور پرانے ہوتے رہتے ہیں لیکن حرم پاک کی نشانیاں نہیں مٹ سکتیں، جہاں ہادیٔ رسول ﷺ کا منبر ہے، جس پر آپ ﷺ چڑھا کرتے تھے)۔

ساتویں صدی ہجری میں علامہ بوصیری محمد بن سعید رحمۃ اللہ علیہ (۶۰۸-۶۹۷ھ) کے ''قصیدہ بردہ'' نے اس صنف میں بڑی مقبولیت حاصل کی، جو ان کے سنگین اور بظاہر لاعلاج مرض سے شفا کا ذریعہ بنا، اس کے علاوہ ان کی متعدد نعتیں ہیں، خاص طور سے ان کا ''قصیدہ ہمزیہ'' بہت مقبول عام قصیدہ ہے، صاحب ''فوات الوفیات'' نے ان کا ایک اور قصیدہ نقل کیا ہے، جس میں علامہ بوصیری نے بارگاہِ رب العالمین میں شکوہ پیش کیا ہے، لیکن ان کی شہرت اور مقبولیت کا سبب قصیدہ بردہ ہے، اس قصیدہ کے عرب شارحین کی تعداد تقریباً ۱۹ ہے، اس کے علاوہ دار الکتب المصریہ میں متعدد شرحیں ہیں، جن کے مصنفین کے نام درج نہیں۔

موجودہ دور میں مصر کے مشہور شاعر احمد شوقی نے جن کو ''امیر الشعراء'' قرار دیا گیا ہے قصیدہ بردہ کی تقلید میں ''نہج البردہ'' کہا جو مقبول عام وخاص ہے اور اس کی وجہ سے شوقی کو بہت شہرت اور مقبولیت حاصل ہوئی ہے۔

اردو اور فارسی کے نعت گو شعراء

فارسی اور اردو شعراء اس صنف میں عرب شعراء سے پیچھے نہیں رہے، بلکہ بقول حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ فارسی کو عربی پر سبقت حاصل رہی ہے اور پھر اردو شاعری کو، حضرت مولانا لکھتے ہیں:۔

> ''جو اہل نظر اسلام کے عالمی ادب سے باخبر ہیں اور جنہوں نے مختلف ملکوں اور مختلف قوموں کی زبان اور ادبیات کا مطالعہ کیا ہے اور اس کے اشعار سے لطف اندوز ہوئے ہیں، وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ فارسی زبان نعت گوئی اور مدح رسول ﷺ میں سب سے خوش نصیب اور سرمایہ دار ہے، اس کے بعد

اردو زبان کا نمبر آتا ہے جو خود فارسی ادب کی خوشہ چیں بلکہ ایک لحاظ سے اس کی پیداوار ہے، یہی وجہ ہے کہ اس موضوع پر جتنا طاقتور، زندہ، مؤثر، نرم وشیریں اور پرسوز کلام ان دونوں زبانوں میں ملتا ہے اتنا کسی اور زبان میں نہیں ملتا ہے، اس میں جذبات کی جو فراوانی اور گرمی و بے چینی نظر آتی ہے وہ دوسری ادبیات میں نظر نہیں آتی ہے اور یہ واقعہ ہے کہ عجمی نژاد شعراء نے ایسے مضامین اور خیالات پیش کئے اور ایسی نئی نئی تعبیریں ایجاد کیں جن میں ان کا پیشرو کوئی نہ تھا"۔(کاروان مدینہ، ص:۱۵۹-۱۶۰، از: مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ)

ہندوستان کے شعراء کے نعت گوئی سے تعلق پر حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ فرماتے ہیں:۔

"نعت گوئی، عشق رسولؐ، اور شوق مدینہ ہندوستانی شعراء کا محبوب موضوع رہا ہے، فارسی شاعری کے بعد سب سے بہتر اور سب سے مؤثر نعتیں اردو ہی میں ملتی ہیں، عشق رسول اور سرزمین حجاز سے گہری وابستگی اور شیفتگی ہندوستانی اسلامی ملت کے مزاج وعناصر ترکیبی میں شامل ہوگئی، اس کی بدولت اس نے ۸سو برس تک اپنے جوہر کی حفاظت کی اور اسی کی وجہ سے قوم پرستی یا وطن پرستی کی غالی تحریکیں، یا لادینیت کا سیلاب کبھی اس کو خس وخاشاک کی طرح بہا نہیں سکا، نبی عربی ﷺ اور حجاز مقدس سے اس نے اپنے تعلق وارادت کا اس طرح اظہار کیا ہے کہ قوم پرستی کے پرجوش علم برداروں نے بعض اوقات اس کو اس کا طعنہ دیا ہے کہ اس ملت کا جسم سرزمین ہند میں رہتا ہے اور اس کا دل وروح سرزمین حجاز میں اور یہ یہاں پیدا ہونے اور یہیں مرنے کے باوجود ہمیشہ مدینہ کی گلیوں ہی کا خواب دیکھتی رہتی ہے اور زبانِ قال یا زبانِ حال سے ہمیشہ یہی صدا بلند کرتی رہتی ہے:

خاک یثرب از دوعالم خوشتراست
اے خنک شہرے کہ آنجا دلبراست
(کاروان مدینہ، ص:۱۷۶، از: مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی)

نعتیہ کلام کی خصوصیات

نبی اکرم رسول مجتبیٰ حضرت محمد ﷺ سے امت اسلامیہ کا یہ گہرا ربط وتعلق اور قلبی وروحانی وابستگی ہر دور میں قائم رہی ہے، آپ ﷺ کے بتائے ہوئے نظام حیات، ضابطۂ زندگی اور آپ کی دعوت وپیغام کو مسلمانوں نے مضبوطی سے اپنے سینوں سے لگائے رکھا، اگر چہ آپ ﷺ کے اخلاق واطوار کو مکمل طور پر اختیار نہ کر سکے، لیکن اتباع سنتِ نبوی، عشقِ رسول اور ذاتِ رسول سے گہری وابستگی ووارفتگی ہر دور میں قائم ودائم رہی، مسلمان حسب استطاعت اور اپنی معلومات کی حد تک سنت نبوی پر قائم رہے اور اپنی زندگیوں کو اس کے مطابق ڈھالنے کی کوشش کرتے رہے، اور بعضوں نے تو مکمل اتباع سنت کا نمونہ پیش کیا جو اخلاق نبوی کی عملی تصویر تھا، بہر حال سرور کائنات آقائے نامدار حضرت محمد مصطفیٰ سے وابستگی وتعلق، آپ کی مدح، شان، منقبت اور آپ کی تعریف وتوصیف میں کمال احتیاط وسنجیدگی، شائستگی، کمال ادب، پاکیزگی، جذبۂ عشق رسولؐ میں حد درجہ سرشاری، نیز درد واثر، سوز وتپش، ہوش، دانش، فہم کے ساتھ عرفان محمدی، فیضان محمدی اور مقام محمدؐ کا پورا ادب واحترام ملحوظ رکھنا امت محمدیہ کا امتیازی وصف ہے، دیگر مذاہب وقوموں میں اس کی مثال نہیں ملتی، بعض قوموں نے تو اپنے انبیاء اور مصلحین کی تعریف میں اتنا مبالغہ کیا کہ ان کو مقام نبوت سے اٹھا کر مقام الوہیت میں پہونچا دیا اور بعض قوموں نے اولیاء وصلحاء کو انبیاء کے مقام سے آگے بڑھا دیا، لیکن مسلمانوں نے خدا اور بندہ کا جو فرق ہے اس کو ملحوظ رکھا۔

نعتیہ کلام میں حیات طیبہ، اخلاق نبوی، مدینہ سے دوری ومہجوری، احساس گناہ، شفاعت طلبی، اشک ندامت، حضور ﷺ کے احسانات کا تذکرہ اور درود وسلام کے

موضوعات ہمیشہ سے موجود رہے ہیں، عربی، فارسی اور اردو کے قدیم وجدید شعراء نے مختلف ادوار میں نعت نبی کے بڑے حسین اسالیب اور عظیم پیرائے نکالے، ان میں محبت وشیفتگی کی حلاوت بھی ہے اور عقیدت واحترام کی لطافت بھی، عشق ووارفتگی کی جنوں آگیں گہرائی بھی اور اکرام واجلال کی احتیاط پسندی بھی، شعراء نے حلیۂ مبارک، بشری صفات، نورانی اوصاف، اخلاق وعادات، خدمات واقدامات اور ذات نبوی سے متعلق ہر شئے کی تعریف وتوصیف کی ہے، جس میں مقام توحید کی نزاکت کا احساس بھی ہے اور بارگاہ نبوی کا ادب وپاس بھی، خود رسول اللہ ﷺ نے عشق نبوی اور اتباع رسول کی نوعیت بیان کردی ہے اور بار بار اس کی تاکید کی ہے کہ آپ ایک انسان ہیں، ایک موقع پر کہا: "أنا ابن امرأة تأكل القديد" میں ایک ایسی عورت کا لڑکا ہوں جو سوکھے گوشت کے ٹکڑے کھاتی تھی، اسی طرح اپنے نام کو اللہ کے نام کے ساتھ جوڑنے کی سخت ممانعت کی ہے، چنانچہ مسلمانوں نے خدا اور بندہ کے درمیان جو فرق ہے اس کو ہمیشہ ملحوظ رکھا اور صحابہ کرامؓ نے عشق نبیؐ اور حب رسولؐ، فدویت، وارفتگی اور شیفتگی کی اعلی مثالیں پیش کی ہیں جو آنے والی نسلوں کے لئے مشعل راہ ہیں۔

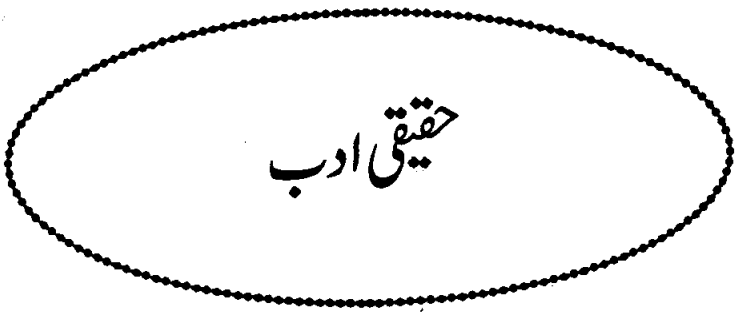
حقیقی ادب

شاعری اور اسلام

شعر وشاعری ایک نازک، حساس اور انقلابی صنف ہے۔ انسان کے مردہ ضمیر کو جھنجھوڑنے کا کام کرتی ہے اور اس کے اندر جوش وولولہ پیدا کر دیتی ہے، کیف کے احساس کو بھی پیدا کر دیتی ہے، اسی طرح نفرت کے احساس کو بھڑکانے کا بھی کام کرتی ہے، وہ خطابت سے زیادہ اثر رکھتی ہے۔ تاریخ میں شاعری کے اثر کے متعدد واقعات ہیں۔

اسلام نے اس مؤثر صنف کو کنٹرول کیا اور اس کو مفید بنانے کے وسائل اختیار کیے ہیں، عصر نبوی میں اس مؤثر ذریعہ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اور اسلام کے دفاع کے لیے استعمال کیا گیا، حضرت حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ نے خاص طور سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دفاع اور ان کی محبت کے لیے اپنی اس صلاحیت کو استعمال کیا، اس پر ان کو شاعر رسول کہا گیا، خود رسول اللہ ﷺ نے اس شاعری کو جس میں اسلام کا دفاع کیا گیا ہو "جہاد باللسان" قرار دیا ہے، حضرت کعب بن مالک رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرض کیا: یارسول اللہ ﷺ شاعری کے متعلق اللہ نے جو کچھ نازل فرمایا وہ معلوم ہی ہے (پھر ہمارا کیا ہوگا) فرمایا: مؤمن اپنی تلوار اور زبان سے بھی جہاد کرتا ہے، قسم ہے اس کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے تم جو اپنی زبان سے ان کو تیر مارتے ہو وہ کمانوں سے تیر مارنے کی طرح ہے۔ (صحیح بخاری کتاب الآداب، باب ما یکرہ أن یکون الغالب علی اللسان الشعر)

حضرت حسان رضی اللہ عنہ کے ایک شعر میں اس تأثیر کا ذکر ہے:۔

لساني صارم لا عيب فيه
وبحري لا تكدره الدلاء

ایک دوسرے موقع پر شعر میں تلوار کی تاثیر کا ذکر کرتے ہیں:۔

لساني وسيفي صارمان كلاهما

ويبلغ ما لا يبلغ السيف مذودي

صحیحین میں حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ کی روایت سے آیا ہے کہ غزوہ بنی قریظہ کے دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ سے فرمایا: ''اهجهم وجبريل معك '' (اے حسان ان کی ہجو بیان کرو جبرئیل تمہارے ساتھ ہیں) اور یہ بھی حضرت حسان سے فرمایا: ''قل وروح القدس معك'' (شعر کہو روح القدس تمہارے ساتھ ہیں)۔

اسلام کے دفاع اور دین کے لیے جوش وولولہ پیدا کرنے کے لیے اور اسلام کی نمائندہ شخصیات کو نمونہ اور آئیڈیل بنانے کے لیے شعر کے ذریعہ سے بڑا کام لیا گیا ہے اور ایسے شعراء کی جنہوں نے اپنی فصاحت لسانی اور جذبہ ایمانی سے اسلام کی خدمت کی، بڑی قدر دانی ہوئی ہے اور ہر دور میں ایسے افراد کی ضرورت رہی ہے، اس لیے شعر میں اللہ نے جو کشش رکھی ہے اگر اس کا صحیح استعمال ہو تو زندگیوں میں ایمانی انقلاب اور سماج میں غیر معمولی تبدیلی آجاتی ہے۔

اس کے برعکس معاملہ ہو تو پھر وہی ہے جیسا کہ قرآن مجید نے کہا:

﴿ وَالشُّعَرَاء يَتَّبِعُهُمُ الْغَاوُونَ، أَلَمْ تَرَ أَنَّهُمْ فِي كُلِّ وَادٍ يَهِيمُونَ، وَأَنَّهُمْ يَقُولُونَ مَا لَا يَفْعَلُونَ، إِلَّا الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ وَذَكَرُوا اللَّهَ كَثِيراً وَانتَصَرُوا مِن بَعْدِ مَا ظُلِمُوا وَسَيَعْلَمُ الَّذِينَ ظَلَمُوا أَيَّ مُنقَلَبٍ يَنقَلِبُونَ ﴾ [شعراء: ۲۲۴-۲۲۷]

شاعروں کی پیروی وہ کرتے ہیں جو بہکے ہوئے ہوں، کیا آپ نے نہیں دیکھا کہ شاعر ایک ایک بیابان میں سر ٹکراتے پھرتے ہیں اور وہ کہتے ہیں جو

کرتے نہیں، سوائے ان کے جو ایمان لائے اور نیک عمل کیے اور بکثرت اللہ کا ذکر کیا اور اپنی مظلومی کے بعد انتقام لیا، جنہوں نے ظلم کیا وہ بھی ابھی جان لیں گے کہ کس کروٹ الٹتے ہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تعریف میں مبالغہ بالکل پسند نہیں فرمایا، بلکہ اس سے روکا ہے، اور ایک حدیث میں نصاریٰ کی طرح عمل سے منع فرمایا کہ انہوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو حد سے بڑھایا۔

ہمارے اسلامی شعراء اسلام کے متعین کردہ حدود کی پابندی کرتے ہوئے شعر کہتے ہیں، اور اس مؤثر ذریعہ سے ذہن سازی اور اسلام کے دفاع کا کام لیتے ہیں۔ نعت اپنی خصوصیات کی وجہ سے شعر کی ایک اہم صنف ہے، اور ہر دور میں شعراء نے نعت کے ذریعہ حب رسول کا اظہار کیا ہے، اکثر شعراء اپنا دیوان حمد اور نعت سے شروع کرتے ہیں، محتاط شعراء نعت اور حمد میں فرق کا لحاظ رکھتے ہیں، نعت مدح سے بھی مختلف ہے، اس کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ اس میں شعر کی دوسری اصناف شامل ہو جاتی ہیں، اس لیے نعت گوئی ہر دور میں اور ہر زبان میں ایک صنف کے طور پر مقبول رہی ہے، اردو میں نعت کو بہت اہمیت حاصل رہی ہے یہاں تک کہ غیر مسلم شعراء میں بھی بعض شاعروں نے نعت کے اشعار کہے ہیں۔

اہل دل کا کلام

ایک حکیم کا قول ہے کہ ''ادب کے اعتبار سے لوگوں کی تین قسمیں ہیں، اہلِ دنیا کے ادب کا انحصار زیادہ تر فصاحت و بلاغت، علوم اور کلام منظوم کے حفظ پر ہے اور اہلِ دین کے نزدیک ادب کا مقصود ریاضتِ نفس، اعضاء و جوارح کی تادیب، حدودِ الٰہی کی حفاظت اور ترکِ شہوات ہے، البتہ اہلِ تصوف کے نزدیک اس کا مقصود قلب کی پاکیزگی، اسرارِ الٰہی کی رعایت، عبد و معبود کے مابین قائم پیمانِ وفا کی پاسداری، اوقات کی حفاظت، بشری خواہشات و تقاضوں کی طرف قلت التفات، طلب میں حسنِ ادب اور حضوری اوقات کا خیال اور مقاماتِ قرب کا استحضار ہے''۔ (رسالۃ المسترشدین، از حارث محاسبی)

قلب کی قسمیں

علامہ ابن قیم جوزیؒ کے نزدیک قلب کی تین قسمیں ہیں، وہ فرماتے ہیں۔

''قلب کی تین حالتیں ہیں۔

(۱) قلبِ صحیح (زندہ دل)

(۲) قلب میت (مردہ دل)

(۳) قلب مریض (بیمار دل)

قلبِ صحیح وہ قلبِ سلیم ہے کہ قیامت کے دن اسی بندہ کو نجات حاصل ہوگی جو خدا کے حضور اس کو لے کر حاضر ہوگا، اللہ رب العزت کا ارشاد ہے ﴿یوم لاینفع مال ولا بنون إلا من أتی اللّٰہ بقلب سلیم﴾ (اس دن نہ مال کام آئے گا اور نہ اولاد، مگر ہاں جو اللہ کے پاس

قلبِ سلیم لے کر آئے گا)۔اس لیے قلبِ سلیم وہ قلب ہے جو اللہ کے حق میں ہر قسم کے شرک سے پاک اور محفوظ ہو، اور اس کی تمام تر تگ ودو خالص اللہ کی لیے ہو، ارادت، محبت، توکل، انابت، سرافگندگی، خشیت اور امید کا مرکز ومحور صرف اور صرف اللہ کی ذات ہو۔

قلبِ میت قلبِ صحیح کی ضد ہے، قلب میت وہ ہے جو زندگی سے محروم ہو، جسے اپنے رب کی معرفت حاصل نہ ہو، اس کی عبادت رب کے حکم، اس کی محبت اور مرضی کے مطابق نہ ہو، بلکہ وہ اپنی خواہشات ولذتوں کا اسیر ہو، اگر چہ اس میں اللہ کی ناراضگی اور غضب کیوں نہ ہو، اس کا مقصود محض خواہشاتِ نفس کی تکمیل ہے، خدا کی خوشنودی اور ناراضگی سے اسے سروکار نہیں ہوتا۔

اور قلبِ مریض وہ قلب ہے جس میں زندگی کی رمق تو ہو لیکن اس میں بے شمار امراض واسقام ہوں، اس اعتبار سے ایسے دل میں دو قسم کے مادے ہوتے ہیں، کبھی یہ غالب تو وہ مغلوب اور کبھی اس کے برعکس، اگر ان دونوں عنصر پر اس کو غلبہ حاصل ہو تو وہ قلب ایمان ومحبت، اخلاص وتوکل کا مرکز بن جاتا ہے اور یہی اس کے حق میں آبِ حیات ہے۔

ایسے قلب میں خواہشات کی محبت، اس کو ہر شئے پر ترجیح، اس کے حصول کا شوق اور تڑپ بھی ہوتی ہے، اسی طرح حسد، کبر ونخوت، تکبر وعناد، دنیا میں حصول اقتدار کے ذریعہ عزت وسربلندی کی محبت کا عنصر بھی شامل ہوتا ہے اور یہی قلب کیلئے موت وہلاکت کا باعث ہے۔

اس اعتبار سے قلب کی پہلی قسم زندگی، انابت وتواضع، نرمی اور ہوشمندی کی آئینہ دار ہوتی ہے اور دوسری قسم ایک خشک وبے جان شئے کی مانند ہے اور تیسری قسم کو مریض کہہ سکتے ہیں کیونکہ ایسا قلب یا تو سلامتی سے

قریب تر ہوگا یا پھر موت وہلاکت کے''۔(طب القلوب، از علامہ ابن قیم الجوزی، ص:۳۴-۳۹)

سچے کلام کی تاثیر

قلب سے جو بات نکلتی ہے وہ قلب پر اثر انداز ہوتی ہے اور وہی حقیقی ادب ہے۔دل کا اثر صرف انسان کے اعمال واخلاق اور سلوک ہی پر نہیں پڑتا، بلکہ علمائے ادب کہتے ہیں کہ اس کا اثر انسان کے کلام پر بھی پڑتا ہے، یہی وجہ ہے کہ اہل دل کا کلام اس کلام سے جدا ہوتا ہے جو دل سے نہیں نکلتا، جاحظ نے ''البیان والتبیین'' میں عامر بن عبدالقیس کا قول نقل کیا ہے کہ:

> جو بات دل سے نکلتی ہے وہ سیدھے دل میں گھر کر جاتی ہے، اور جو بات صرف زبان سے نکلتی ہے وہ کانوں سے آگے نہیں بڑھتی'' ہر کہ از دل خیزد بر دل ریزد۔
>
> حسن بصریؒ نے ایک بے اثر واعظ کے کلام کو سن کر کہا تھا کہ اے واعظ خشک! یا تو تیرے دل میں کوئی خرابی ہے یا پھر میرے دل میں''۔(البیان والتبیین، از: علامہ ابوعثمان بن بحرالجاحظ)

اہل دل کا ادب

تاریخ میں ایسے صلحاء اور اہلِ دل علماء کے کلام کا وافر ذخیرہ موجود ہے جو پابندِ شریعت تھے، ان میں خدا کا خوف، محاسبۂ نفس، احتساب زندگی، زہد وورع کی صفات بدرجۂ اتم موجود تھیں، تذکرہ وتراجم کی کتابوں میں ان اہل دل علماء کے مواعظ وخطبات کی تاثیر کے واقعات کثرت سے منقول ہیں کہ ان کے موثر مواعظ نے دل کی قساوتوں کا کتنا موثر علاج کیا اور کس قدر خوبی کے ساتھ ان کو صیقل کیا اور منزہ ومجلی بنایا، یہ الگ بات ہے کہ اہلِ ادب نے عموماً اس جانب توجہ نہیں دی، ان اہل دل علماء اور واعظین میں حضرت ابوسعید

حسن بصریؒ کا نام بہت نمایاں ہے، حجاج بن یوسف ثقفی کے ساتھ ان کے بہت سے واقعات اور مواقف کافی مشہور ہیں، ان کے مواعظ کی تاثیر کا عالم یہ تھا کہ عظیم اسلامی شاعر فرزدق جب بھی آپ کی خدمت میں حاضر ہوتا تو اپنی آوارگی اور اباحیت پسندی سے توبہ کرتا، ایک مرتبہ تو اس نے خود کو ایک ستون سے باندھ لیا اور یہ عہد کیا کہ جب تک قرآن حفظ نہ کرلوں گا یہ بیڑیاں نہ کھولوں گا، اپنی توبہ اور حکایتِ حال کے بیان میں اس کے کئی قصائد بھی ہیں، تراجم وسوانح کی کتابوں میں حضرت حسن بصریؒ کے پراثر مواعظ وخطبات، اور جابر وقاہر سلاطین وامراء کے دلوں میں ان کی تاثیر کے واقعات کثرت سے مذکور ہیں۔

چند مشہور اہل دل

تراجم کی کتابوں میں جن صالحین کے مؤثر خطبات ومواعظ اور حالاتِ زندگی کا تذکرہ ملتا ہے ان میں چند اہم اور نمایاں نام یہ ہیں۔

فضیل ابن عیاضؒ (متوفی ۱۸۷ھ) ابو محفوظ معروف ابن فیروز کرخیؒ (م ۲۰۰ھ) ابوالفیض ذوالنون مصریؒ (متوفی ۲۴۵ھ) حارث محاسبیؒ (متوفی ۲۵۳ھ) ابوالحسن سری ابن مغلس ابن السقطیؒ (متوفی ۲۵۳ھ) ابومحمد سہل ابن عبداللہ تستریؒ (متوفی ۲۸۳ھ) ابو القاسم جنید ابن محمد ابن جنید بغدادیؒ (متوفی ۲۹۷ھ) احمد ابن محمد ابن سہل ابن عطاءؒ (متوفی ۳۰۹ھ) ابوالقاسم عبدالکریم ابن ہوازن صاحب ''الرسالۃ'' (متوفی ۴۶۵ھ) حجۃ الاسلام ابوحامد محمد غزالیؒ صاحب ''احیاء علوم الدین'' (متوفی ۵۰۵ھ) شیخ عبدالقادر جیلانیؒ (متوفی ۵۶۱ھ) ابوالفرج عبدالرحمٰن ابن جوزیؒ (متوفی ۵۹۷ھ) وغیرہ، ان اہل دل علماء اور صلحاء کے کلام میں عجیب وغریب تاثیر ہے جس کا اثر صدیاں گذرنے کے باوجود آج بھی دلوں میں محسوس ہوتا ہے، ان مواعظ کا امتیاز یہ ہے کہ ان میں نفس انسانی کی مختلف کیفیات وواردات، احساسات ووجدانات کا تذکرہ اور ان کا کامیاب علاج موجود ہے، اسی وجہ سے ان مواعظ کے ذریعہ انسانی قلب ووجدان اور شعور پر غیر معمولی اثر پڑتا ہے اور زندگی کا رخ بدل جاتا ہے۔

ہندوستان کے صلحاء

سرزمین ہند بھی ایسے نفوس قدسیہ سے محروم نہیں رہی، یہاں بھی اصحاب صدق وصفا کی ایک تعداد بعد کی صدیوں میں پیدا ہوئی، مثلاً شیخ فرید الدین مسعود ایودھنیؒ (متوفی ۶۶۴ھ) شیخ بہاء الدین زکریا ابن محمد ملتانیؒ (متوفی ۶۶۶ھ) شیخ نصیر الدین چراغ دہلویؒ (متوفی ۷۵۷ھ) شیخ نظام الدین بدایونیؒ (ولادت ۶۵۶ھ وفات ۷۵۷ھ) امام ربانی شیخ احمد ابن عبدالاحد سرہندیؒ مجدد الف ثانی (متوفی ۱۰۳۴ھ)، امام ربانی کے شیخ، شیخ باقی باللہؒ (متوفی ۱۰۱۵ھ) جو کابل سے ہندوستان وارد ہوئے تھے، ان کا کلام نہایت مؤثر ہوتا، مؤرخین نے لکھا ہے کہ جو بھی ان کی مجلس میں حاضر ہوتا اس کی دل کی دنیا بدل جاتی، امام سرہندیؒ کے رسائل میں بھی عجب تاثیر ہے، ان میں آج بھی وہ قوت واثر ہے جس سے نہاں خانۂ دل میں سوز وساز اور رقت ونرمی کی کیفیت پیدا ہوتی ہے، دلوں کی کشش کی عجیب تاثیر ہے، فنی اعتبار سے ان رسائل کی بہت اہمیت ہے، دیگر ادبی رسائل جو فن ادب کی کتابوں میں منقول ہیں، ان میں اتنی قوت وتاثیر نہیں جو شیخ سرہندیؒ کے رسائل میں موجود ہے اس لیے کہ ان رسائل نے اس عہد کی زندگی میں اپنی ساحرانہ تاثیر سے عجیب انقلاب برپا کر دیا تھا اور آج بھی ان رسائل سے دلوں کی سرد انگیٹھی میں حرارت اور گرمی پیدا ہوتی ہے، اسی طرح شیخ کے نامور شاگردوں اور مریدین کا بھی ایک طویل سلسلہ ہے جن کے کلام میں اثر آفرینی کی صلاحیت پائی جاتی ہے، مثلاً شیخ آدم بنوریؒ (متوفی ۱۰۵۳ھ)، شیخ محمد معصومؒ (ولادت ۱۰۰۷ھ وفات ۱۰۷۹ھ) اور ان کے اہلِ دل مریدین و متوسلین میں شیخ الاسلام احمد ابن عبدالرحیم معروف بہ شیخ ولی اللہ دہلویؒ (۱۱۱۴ھ-۱۱۷۶ھ) اور پھر شاہ صاحب کے مریدین میں شیخ مرزا مظہر جانِ جاناںؒ (ولادت ۱۱۱۱ھ یا ۱۱۱۳ھ وفات ۱۱۹۵ھ) شیخ عبدالعزیز دہلویؒ (۱۱۵۹ھ-۱۲۳۹ھ) کے خطوط، مواعظ اور بیانات میں بڑی دل آویزی اور مقناطیس کی جاذبیت آج بھی پائی جاتی ہے، شیخ عبدالعزیز دہلوی نے ادبی اسلوب خصوصاً اردو زبان کی تہذیب وتنقیح اور ترقی میں بڑا رول ادا کیا ہے۔۔

امام حسن بصریؒ کے مواعظ کی تاثیر و بلاغت

امام حسن بصریؒ کے کلام کی اثر آفرینی، حلاوت و چاشنی اور ساحرانہ تاثیر پر علمائے ادب کا اتفاق ہے، امام ادب ابوعمرو بن العلاء حضرت حسن بصریؒ کے سلسلہ میں کہتے ہیں کہ

''میں نے حسن بصری اور حجاج ابن یوسف سے بڑھ کر فصیح اللسان نہیں دیکھا اور حسن بصری حجاج سے زیادہ فصیح ہیں''۔

امام ابوحامد غزالیؒ ''احیاء علوم الدین'' میں رقمطراز ہیں کہ

''حسن بصری کا کلام انبیاء علیہم الصلوۃ والسلام کے کلام سے بہت مشابہ تھا اور ان کا طریقہ زندگی صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین سے قریب تر تھا، اس پر سب کا اتفاق ہے، حسن بصریؒ ایک طاقتور اور پرکشش و محبوب شخصیت کے حامل تھے، لوگ ان کی جادو بیانی کے سامنے مبہوت و ششدر رہ جاتے اور بیساختہ ان کی عظمت کے قائل ہوتے، ثابت ابن قرہ ابن زہرون حرانیؒ (۲۲۱ھ - ۲۸۸ھ) کہتے ہیں کہ حسن بصری ایک بحرِ زخار اور دمکتا ہوا آفتاب تھے، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے تعلق سے ارباب سلطنت کے دربار میں ان کی حق گوئی اور بیباکی کے واقعات بہت مشہور ہیں کہ ان کی زبان حق بیاں یہاں بھی اظہار حق سے باز نہ آئی''۔

حسن بصری اپنے ایک وعظ میں فرماتے ہیں:۔

''ہائے افسوس! لوگوں کو امیدوں اور خیالی منصوبوں نے غارت کیا، زبانی باتیں ہیں، عمل کا نام و نشان نہیں، علم ہے مگر (اس کے تقاضوں کو پورا کرنے کیلئے) صبر نہیں، ایمان ہے مگر یقین سے خالی، آدمی بہت نظر آتے ہیں مگر دماغ نایاب، آنے جانے والوں کا شور ہے مگر ایک بندہ خدا ایسا نظر نہیں آتا جس سے دل لگے، لوگ داخل ہوئے اور پھر نکل گئے، انھوں نے سب کچھ جان لیا پھر مر گئے، انہوں نے پہلے حرام کیا پھر اسی کو حلال کر لیا، تمہارا دین کیا

ہے؟ زبان کا ایک چٹخارہ! اگر پوچھا جاتا ہے کیا تم روزِ حساب پر یقین رکھتے ہو؟ تو جواب ملتا ہے ہاں ہاں! قسم ہے روز جزا کے مالک کی، غلط کہا، مومن کی شان تو یہ ہے کہ قوی فی الدین ہو، صاحبِ ایمان و یقین ہو، اس کے علم کے لیے حلم اور اس کے حلم کے لیے علم باعثِ زینت ہو"۔

کلامِ اہلِ دل کی تاثیر کا راز

صلحاء اور اہل دل کے کلام میں جو غیر معمولی حلاوت، قوت، دل آویزی، تأثیر اور جاذبیت ہے وہ ان کی روح کی لطافت اور قلب کی پاکیزگی، اخلاص وللّٰہیت، حب الٰہی اور عشق نبوی اور اندرونی کیفیت وسرمستی اور سوز دروں کا نتیجہ ہے، اور اس کے لیے وہ کسی خارجی مدد، مقام اور وقت کے محتاج نہیں ہوتے، ان کی خوشی وسرمستی کا سرچشمہ اور ان کی دولت کا خزانہ ان کے دل میں ہوتا ہے، خواجہ میر درد نے جو خود صاحبِ دل اور صاحبِ درد تھے اس پورے گروہ کی ترجمانی اس شعر میں کی ہے۔

جائیے کس واسطے اے درد میخانے کے بیچ
کچھ عجب مستی ہے اپنے دل کے پیمانے کے بیچ

اندرونی کیفیت اور سوز دروں دلوں کو مسخر کر لیتا ہے، سنگ دلوں کو موم بنا دیتا ہے، مولانا جلال الدین رومیؒ کہتے ہیں:۔

ازمحبت تلخہا شیرین شود
وز محبت مسہا زریں شود
از محبت دردہا صافی شود
وز محبت دردہا شافی شود
از محبت سجن گلشن می شود
بے محبت روضہ گلخن می شود

از محبت سنگ روغن می شود
وز محبت موم آہن می شود
از محبت سقم صحت می شود
وز محبت قہر رحمت می شود
از محبت مردہ زندہ می شود
وز محبت شاہ بندہ می شود

ترجمہ: محبت سے تلخی میں مٹھاس وشیرینی پیدا ہوجاتی ہے، محبت مٹی کو سونا بنادیتی ہے، محبت درد والم کو شفا کا پیام اور راحتِ دوام بنادیتی ہے، محبت کی وجہ سے قید خانہ بھی گلشن بن جاتا ہے اور محبت کے بغیر ایک گلشن بھی جہنم کدہ معلوم ہوتا ہے، محبت پتھر کو پانی اور آہن کو موم بنادیتی ہے، محبت سے بیماری صحت میں تبدیل ہوجاتی ہے اور اسی سے قہر عین رحمت بن جاتا ہے، محبت میں وہ قوت ہے جو مردہ کو زندہ کردے اور شاہ کو غلام بنادے۔

فرماتے ہیں کہ

جسم خاک از عشق بر افلاک شد
کوہ در رقص آمد وچالاک شد
عشق جان طور آمد عاشقاں
طور مست وخر موسی صعقا

ترجمہ: عشق ومحبت کی وجہ سے جسم خاکی آسمان کے بلندیوں میں پرواز کرنے لگتا ہے، کوہ ودمن میں رقص وسرود کی کیفیت پیدا ہوجاتی ہے، وہ زمین کی پستیوں کو پیچھے چھوڑ آسمان کی رفعتوں سے ہم کلام ہوجاتا ہے، ایک ہی جست میں وہ تحت الثری سے ثریا میں پہونچ جاتا ہے۔

ادب میں سوز دروں اور خون جگر کی اہمیت

مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

''ادب وانشاء کے سلسلہ میں عام مؤرخ ونقاد اکثر اس حقیقت کو نظر انداز کر دیتے ہیں کہ تحریر کی قوت، کلام کی تأثیر اور قبول عام وبقائے دوام کے لئے سب سے زیادہ معاون عنصر لکھنے والے کی اندرونی کیفیات، اس کا یقین، دلی جذبہ، کسی حقیقت کے اظہار کے لئے اس کی بے چینی و بے قراری ہے، ایسے کسی شخص کو جو اس اندرونی کیفیت سے سرشار اور اس کو دوسروں میں پیدا کرنے کے لئے مضطرب و بے قرار ہو جب قدرت کی طرف سے ذوق سلیم بھی عطا ہو، الفاظ واسالیب بیان پر ضروری حد تک قدرت بھی حاصل ہو اور اس کی تحریر میں علم وادب، عقل واستدلال اور حسن بیان کے ساتھ سوز دروں اور خون جگر بھی شامل ہو تو اس کی تحریر میں ایسا اثر اور ایسا زور پیدا ہو جاتا ہے کہ وہ اپنے زمانہ میں ہزاروں دلوں کو زخمی کرتی ہے اور سیکڑوں برس گزر جانے کے بعد بھی اس کی تازگی اور زندگی اور اس کی تأثیر اور قوت تسخیر قائم رہتی ہے''۔

مفکر اسلام آگے لکھتے ہیں:۔

''ناقدین ادب نے وقت، ماحول، فضا اور طبیعت کے فراغ کو ادب وشاعری کے لئے بہت زیادہ سازگار اور معاون عنصر تسلیم کیا ہے اور بہت سے ادیبوں اور شاعروں نے اس کا اظہار کیا ہے، کہ لب جو، کنار دریا، گوشۂ چمن، فصل بہار، نسیم سحر، صبح کا سہانا وقت، ان کی شاعری اور ان کے ادب کے لئے محرک بن جاتا ہے، اور ان میں بہت لوگ ایسے مقام کی تلاش اور ایسے وقت کے انتظار میں رہتے ہیں، اس طرح یہ حقیقت تسلیم کر لی گئی کہ روح کی لطافت اور دماغ کا سکون ادبیات کے لئے بہت معاون ہے''۔

کلام اہل دل کی تاثیر کا اصل منبع درحقیقت ان کا صفائے باطن، ریاضت ومجاہدہ، تزکیہ قلب، حرص وہوس کی مخالفت، معاصی اور غفلت سے دلوں کی حفاظت اور ماسوی اللہ سے استغناء ہے۔

مواعظ وملفوظات کی تاثیر

کلام کا مصدر ومنبع اگر ایسے مصلح ومہذب انسان کی زبان ہو جو قلب کی پاکیزگی، فکر کی بلندی، مکروہات ورذائل سے اجتناب، جذبۂ صادق، جذب وانفعال، سوز وگداز کی صفات سے آراستہ ہو اور صرف صاحب قال ہی نہیں؛ بلکہ صاحب حال ہو، تو اس کا کلام براہ راست دل پر اثر انداز ہوتا ہے، تاریخ وسیر کی کتابوں میں ایسے اہلِ دل صالحین کے کلام کی اثر اندازی کے بہت سے واقعات مذکور ہیں، امام احمد ابن عرفان شہیدؒ (۱۲۰۱ھ ۱۲۴۶ھ) کے حالات میں آتا ہے کہ ان کی مجلس میں بڑے بڑے چور، ڈاکو، قاتل اور فاسق وفاجر حاضر ہوتے اور اپنے گناہوں سے تائب ہوتے، کہا جاتا ہے کہ جب وہ شہرِ کلکتہ وارد ہوئے تو شراب خانوں اور سنیما گھروں میں تالے پڑ گئے۔

ان کے مخلص مریدین کے کلام میں بھی وہی تاثیر تھی، ان اہل دل واعظین کے تذکرہ میں بہت سی کتابیں ہیں، ان صلحاء وعارفین کو وفات پائے زمانہ ہو گیا پر آج بھی ان کے مواعظ وارشادات میں وہی جدتِ تاثیر ہے۔

ان حضرات میں جو قوت بیان، فصاحت وبلاغت کے رمز آشنا تھے، انہوں نے خود بھی اپنی تصنیفی یادگار چھوڑی ہیں، اصلاح وتربیت کے باب میں ان کے رسائل بہت اہمیت اور جلالتِ قدر کے حامل ہیں، دینی حلقوں میں ان کی بہت عزت اور بڑا مقام ہے کیونکہ یہ اصلاح وتربیت، دعوت خیر اور اصلاح وارشاد کا بہت بڑا ذریعہ ہیں، بعض کتابیں تو حجم کے اعتبار سے بہت ضخیم اور کئی کئی جلدوں میں ہیں، مثلاً عوارف المعارف، احیاء علوم الدین از امام غزالیؒ اور بعض رسائل کی شکل میں ہیں جیسے رسالہ قشیریہ اور رسالۃ المسترشدین از حارث محاسبیؒ۔

شیخ عبدالفتاح ابوغدہؒ شرح رسالۃ المسترشدین کے مقدمہ میں لکھتے ہیں کہ

"شیخ حارث محاسبی نے اس رسالہ میں بہت قیمتی نصائح، عمدہ ارشادات، موعظتِ تامہ، واضح تنبیہات، مخلصانہ اقوال وتوجیہات کو علم وحکمت اور معانی

ومفاہیم سے لبریز جملوں اور دلنشیں اسلوب میں بیان کیا ہے، جن کو بہ آسانی پڑھا اور سمجھا جاسکتا ہے، لیکن قاری کو بھرپور فائدہ تب ہوگا، جب نہایت غور وتدبر کیساتھ ایک ایک جملہ بار بار اتنا پڑھے اور اس میں تدبر کرے کہ وہ یاد ہوجائے اور زبانی دوہرا سکے''۔

علامہ عبدالرحمٰن ابن جوزیؒ صالحین کے کلام کی تاثیر پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں کہ

''صلاحِ قلب کے لیے حدیث وفقہ کے اشتغال کو میں اسی وقت مفید سمجھتا جبکہ اس کے ساتھ مواعظ ورقائق اور سیرتِ صالحین پر بھی نظر اور تدبر ہو، کیونکہ یہی وہ لوگ ہیں جن کو کلام منقول کا مقصود حاصل ہے، اور انہوں نے افعال کی حکمی صورت سے نکل کر اذواق وکیفیات کی دنیا تک رسائی حاصل کرلی ہے''۔

فرماتے ہیں کہ

''ان مشاہیر میں سے ہر ایک پر میں نے ایک مستقل کتاب لکھی ہے جن میں ان کے حالات اور آداب واخلاق کا تذکرہ ہے، مثلاً حضرت حسن بصریؒ، سفیان ثوریؒ، ابراہیم ابن ادہمؒ، بشر حافیؒ، احمد ابن حنبلؒ اور معروف کرخیؒ وغیرہ کے حالات میں کتابیں لکھی ہیں''۔ (صیدالخاطر)

ان کے علاوہ دیگر علماء نے بھی طبقات وتراجم اور سوانح صالحین کے موضوع پر باقاعدہ مبسوط ومفصل کتابیں لکھی ہیں جو دائرۃ المعارف کی حیثیت رکھتی ہیں۔

اس مؤثر وجاذبِ قلب ونگاہ صنف کلام کو افسوس کہ ادب میں وہ مقام نہ دیا گیا جس کا وہ مستحق تھا اور وہ اپنی تاثیر وسحر آفرینی، حسن وجمال کے باوجود نقد وادب کا موضوع نہ بن سکا، عالمی رابطہ ادب اسلامی نے شروع ہی سے اس پر توجہ دی ہے اور اس موضوع پر کئی سیمینار منعقد کیے ہیں۔

سوانحی ادب اور تعمیری قدریں

اس موضوع پر ایک سیمینار حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ کی صدارت میں دارالمصنفین اعظم گڑھ میں ۱۹۹۵ء میں ہوا تھا، اس میں سوانح نگاری پر بڑے مفید مقالے پیش کیے گئے تھے، حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے خطبۂ صدارت میں اس موضوع کے تعلق سے جو ارشاد فرمایا تھا، اس سے اس موضوع پر اسلامی نقطۂ نظر کی وضاحت ہوتی ہے، مولانا نے اپنے خطاب میں فرمایا:۔

"کسی نامور شخصیت کا تذکرہ لکھنا، یا کسی انسان کے اوصاف بیان کرنا، اتنا آسان اور اتنی عمومیت کا کام نہیں، جتنا کہ بعض اہل قلم سمجھتے ہیں، بلکہ اس کے لیے بڑی فراست اور تلاش وجستجو کی ضرورت پڑتی ہے، اور اس میں وہی سوانح نگار کامیاب ہوسکتا ہے جو اس حقیقت سے واقف ہو کہ الفاظ اور خاص طور پر تعریفی وتنقیدی الفاظ کا بھی ایک درجہ حرارت وبرودت (ٹمپریچر) ہوتا ہے، اور اس کا پورا لحاظ رکھتے ہوئے اور مدح اور ممدوح کا موازنہ کرتے ہوئے ان کا استعمال کیا جانا چاہئے، اس کے علاوہ بعض دوسرے اصول وشرائط بھی ہیں:۔

۱۔ پہلی شرط یہ ہے کہ سوانح نگار جس شخصیت کا تذکرہ کرے، اس سے پوری طرح واقف ہو، اس کے اچھے اور برے پہلوؤں پر اس کی نظر ہو اور ان میں امتیاز کرنے کی صلاحیت اس کے اندر موجود ہو، اب اگر اس کی یہ واقفیت براہ راست ہے (رفاقت یا ملاقات کے ذریعہ) تو یہ سب سے بہتر شکل ہے، اور اگر اس کی واقفیت کا ذریعہ مطالعہ ہے، تو اس کے لیے ضروری ہے کہ یہ مطالعہ خالی الذہن ہوکر کیا گیا ہو، اور اس میں دوسرے عناصر وموثرات شامل نہ ہوں۔

۲۔دوسری شرط یہ ہے کہ سوانح نگار کو صاحب سوانح سے ایسا تعلق ہو جو اس کے اندر اس کے حالات جاننے کا شوق، اس کی خصوصیات سے واقف ہونے کا داعیہ، اور اس کی زندگی کی گہرائیوں میں اتر جانے کا جذبہ پیدا کرتا ہو۔

۳۔تیسری شرط یہ ہے کہ سوانح نگار زبان کے مزاج سے آگاہ، اس کی روایت، لفظوں کے صحیح معنی، اور محاوروں کے صحیح استعمال سے واقف ہو، جو لفظ وہ استعمال کرے موتی کی طرح روشن ہو، الفاظ اس کے اشارہ کے منتظر ہوں، اور ان کا اتنا بڑا ذخیرہ اس کے پاس موجود ہو کہ وہ جس معنی و مفہوم کو ادا کرنا چاہتا ہے، اس کے لیے موزوں ترین لفظ اسے آسانی کے ساتھ میسر آجاتا ہو۔

۴۔چوتھی شرط یہ ہے کہ وہ امانت دار ہو، ذمہ داری کا اسے پورا احساس ہو، کلمات کی ترتیب کا اسے سلیقہ ہو، جملوں کی بندش کا اسے ملکہ ہو، کہ وہ جو لباس صاحب سوانح کو پہنانا چاہتا ہے، وہ اس کے قد و قامت اور حجم کے مطابق ہو، نہ کسا ہو، نہ ڈھیلا ہو، کیونکہ اگر وہ چھوٹے قد والے کے لیے لمبا لباس تیار کرے گا تو چھوٹا شخص اور بھی چھوٹا نظر آئے گا اور دیکھنے والا یہ کہنے پر مجبور ہوگا یہ تو کسی اور کا لباس ہے، جو قد میں اس سے لمبا ہے، تو جس طرح انسان کا ایک جسم ہوتا ہے جس کی مناسبت سے لباس تیار کیا جاتا ہے، اسی طرح اس کے اوصاف و کمالات ہوتے ہیں، جن کو پیش نظر رکھتے ہوئے الفاظ کا انتخاب کیا جاتا ہے، الفاظ کے انتخاب میں ذرا سی کوتاہی اور اس کے ٹمپریچر میں ذرا سی کمی زیادتی سے صاحب تذکرہ کی شخصیت پر دوسری شخصیت کا خول چڑھ جاتا ہے، اور قد و قامت کے ناپنے میں غلطی کرنے سے بڑا جرم مقام و مرتبہ کی صحیح تعیین نہ کرنا ہے۔

اسی طرح کسی شخصیت کا تعارف کرانے، یا اس کی سوانح عمری بیان کرنے کے لئے ضروری ہے کہ لکھنے والے کے دل میں اس کے لئے عقیدت

ومحبت کے جذبات ہوں، دوسروں کے سامنے اس کو پیش کرنے کا اس کے اندر تقاضا ہو، افکار ونظریات میں انسانی حد تک ہم آہنگی ہو، اور صاحب تذکرہ کی توصیف اس کے ضمیر کی آواز اور اس کے دل کی ایک آرزو کی تکمیل ہو۔

یا پھر اس کے قلم اٹھانے کا محرک ایسی شخصیت کا دفاع ہو جس کا حق چھینا جارہا ہو، اس کا وقار مجروح کیا جارہا ہو، اور اس کو بے جا قفص اتہام میں کھڑا کیا جارہا ہو۔

یا پھر اس کے قلم کو حرکت دینے والی چیز صاحب تذکرہ پر اعتماد کی بحالی یا اس کے فضل کا اعتراف یا اس کی دل آویز اور باکمال شخصیت کی گرویدگی کا اظہار ہو۔

جس تحریر کے پس منظر میں یہ عوامل کارفرما نہیں ہوتے وہ تحریر بے اثر اور بے جان ہوتی ہے۔

سوانح نگار کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ الفاظ کے زیر وبم، اتار چڑھاؤ اور ان کی گرم وسرد تاثیر سے پوری طرح واقف ہو، گرم لفظ کی جگہ سرد لفظ کا استعمال تو درکنار معمولی حرارت رکھنے والے الفاظ کی جگہ تیز حرارت رکھنے والے لفظ کا استعمال بھی نہ کرتا ہو، سوانح نگار کے لیے اس کا لحاظ بھی ضروری ہے کہ وہ کسی متوسط شخص کے لئے ایسے الفاظ استعمال نہ کرے جس سے وہ تصویر سامنے آئے جو کسی باکمال اور عبقری (Genius) انسان یا غیر معمولی ذہانت کی حامل، حسن اخلاق سے آراستہ اور وسیع اور عمیق علم رکھنے والی شخصیت کی ہوا کرتی ہے۔ سوانح نگار کی ایک ذمہ داری یہ بھی ہے کہ وہ صاحب سوانح کو اسی طبقہ میں رکھے جس طبقہ کی وہ نمائندگی کرتا ہو، اور اس کی زندگی کے ایسے پہلو کو اجاگر کرے جو اس کو دوسری شخصیات سے جدا کرتا ہو"۔ (سہ ماہی کاروان ادب، جلد ۳، شمارہ نمبر ۳-۴، اکتوبر تا دسمبر ۱۹۹۶ء و جنوری تا مارچ ۱۹۹۷ء)

اسلامی ادب میں سوانح نگاری

اسلامی ادب میں سوانح نگاری کی ابتداء سیرت نبویؐ سے ہوئی ہے؛ جس طرح تاریخ کی ابتدا مغازی سے، سیرت نبویؐ کے بعد صحابہ کرامؓ اور مصلحین عظام اور علماء وحکماء کے تذکروں اور سیرت، کا سلسلہ شروع ہوا، اور اس عہد تک یہ سلسلہ جاری ہے۔

ندوۃ العلماء سے تعلق رکھنے والے اہل قلم نے تاریخ اسلام کے ساتھ سیرت نگاری کو خاص موضوع بنایا، دارالمصنفین کے علاوہ جس کا اس موضوع میں اہم حصہ رہا ہے، حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی جو رابطہ ادب اسلامی کے مفکر اور تنظیم ادب اسلامی کے مؤسسین میں ہیں، اس موضوع پر ''نبی رحمتؐ'' کے علاوہ اہم کتابیں تصنیف کیں، جن میں سب سے نمایاں ''سیرت سید احمد شہید'' ہے، جو بہت مقبول ہوئی، اس کے علاوہ ''تاریخ دعوت وعزیمت''۔ ''حیات عبدالحی''۔ ''سوانح حضرت مولانا عبدالقادر رائے پوری''۔ ''سوانح حضرت مولانا شیخ الحدیث محمد زکریا کاندھلوی''۔ ''مولانا الیاس اور ان کی دینی دعوت''۔ ''تذکرہ مولانا فضل رحمٰن گنج مرادآبادی'' اور ''پرانے چراغ'' ہیں، جو اپنے ادبی، تاریخی اور تربیتی اسلوب کی وجہ سے ادبی حلقوں میں بہت مقبول ہوئیں، حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی کی ''سیرت سید احمد شہید'' کے پڑھنے کے بعد قاری کے ذہن میں ایک جذبہ اور ایک شخصیت کی اقتداء کا احساس پیدا ہو جاتا ہے۔

ندوی مکتبہ فکر کی سوانح نگاری کی بنیادی خصوصیات عقیدت مندی کی وجہ سے جو سوانح میں مبالغہ آمیزی پائی جاتی ہے، اس سے اجتناب، روایات کی علمی تحقیق، انتخاب، اسلوب بیان میں ادبیت، زندگی کے مختلف شعبوں کی عکاسی اور اس کا التزام کہ قارئین کو اس تذکرہ سے کیا پیغام ملتا ہے اس کی کوشش کا اہتمام ہیں۔

اس طرز نگارش اور سوانح نگاری میں نمایاں مقام مولانا شبلی نعمانی کو حاصل ہے جن کی ''سیرت النبی'' کے علاوہ ''الفاروق'' ''الغزالی''۔ ''سوانح مولانا روم''۔ ''المامون'' اور

''سیرت النعمان'' جیسی محققانہ اور بلند پایہ تصنیفات ہیں، علامہ سید سلیمان ندوی کی ''حیات امام مالک''۔ ''سیرت عائشہ''۔ ''حیات شبلی''۔ ''عمر خیام'' اور ''یادرفتگان'' جیسی تالیفات ہیں، مولانا عبد السلام ندوی نے ''اسوۂ الصحابہ''۔ ''سیر الصحابیات''۔ ''سیرت عمر بن عبدالعزیز''۔ ''شعر الہند''۔ ''اقبال کامل''۔ ''امام رازی''۔ ''حکمائے اسلام''۔ ''ابن خلدون''۔ ''ابن یمین'' اور ''فقرائے اسلام'' وغیرہ لکھ کر اردو تذکرہ نگاری اور سوانحی ادب میں بیش قیمت اضافہ کیا، مولانا حاجی معین الدین احمد ندوی نے ''خلفائے راشدین'' اور ''مہاجرین'' (حصہ اول) لکھی، مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی نے ''مہاجرین'' (حصہ دوم) سیر الصحابہ'' (ششم وہفتم) تابعین'' اور ''حیات سلیمان'' لکھی، مولانا مجیب اللہ ندوی نے ''اہل کتاب صحابہ وتابعین اور تبع تابعین (جلد اول) لکھی، مولانا عبداللہ عباس ندوی نے ''میر کارواں'' لکھی، اور اخیر عہد میں مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی نے ''رہبر انسانیت محمد صلی اللہ علیہ وسلم'' کے علاوہ ''مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی ایک عہد ساز شخصیت'' اور ''یادوں کے چراغ'' لکھی، ان حضرات کے علاوہ بھی متعدد ندوی فضلاء کا سوانحی ادب میں گراں قدر اضافہ ہے اور یہ سلسلہ جاری ہے۔

ندوی فضلاء جن کا بیسویں صدی میں سوانحی ادب اور تعمیری قدروں کو فروغ دینے میں نمایاں حصہ ہے، ان کے علاوہ مولانا حالی، مولانا حمید الدین فراہی، پروفیسر خلیق احمد نظامی، پروفیسر ضیاء الحسن فاروقی، مولانا ابو محفوظ الکریم معصومی، مولانا عبد السلام مبارک پوری، مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمی، مولانا قاضی اطہر مبارک پوری، مولانا صفی الرحمٰن مبارک پوری، مولانا عبد الرزاق کان پوری، مولانا اکرام اللہ خاں اور مولانا عبد الماجد دریابادی وغیرہ اہل قلم نے بھی سوانحی ادب اور تعمیری قدروں کو فروغ دینے میں بڑا حصہ لیا ہے۔

اسلامی ادب کی دعوت اور فکر یہ ہے کہ ادب صرف تفریح یا وقت گذاری کا ذریعہ نہیں، بلکہ ادب ذہن سازی اور تاثیر قلبی کا ذریعہ ہے، وہ تعمیری ہے اگر اس کی رعایت کی جائے، اور تخریبی ہے اگر اس کا اسلوب بیان یا موضوع کا انتخاب صرف اظہار رائے یا پڑھنے

والے کی تفریح کے لیے، یا مقبولیت حاصل کرنے کے لیے کیا جائے۔

سوانح نگاری ادب کی اہم قسموں میں سے ہے اور ہر دور اور ہر زبان میں اس کو اہمیت دی گئی ہے، اور اس کے مختلف نمونے ملتے ہیں، اس میں ادباء، علماء، مصلحین اور سیاسی قائدین اور ملوک وحکام اور قائدین کے تذکرہ آتے ہیں۔

بعض اہم شخصیات نے اپنے تجربات اور مشاہدات زندگی کے نشیب وفراز کو قلم بند کیا ہے، بیسویں صدی میں اردو زبان میں اس کا اچھا خاصہ سرمایہ پایا جاتا ہے۔

اردو میں سوانحی ادب کی مختلف جہتیں ہیں، مذہبی، سیاسی، سماجی اور ادبی، ہر طرح کا مواد اس کا موضوع بن سکتا ہے، اس کی شکلیں بھی مختلف ہیں، اس کی ایک قسم خودنوشت میں مکمل نامکمل، مختصر، طویل، مکتوباتی، افسانوی، ناول، تذکراتی اور منظوم شکلیں ملتی ہیں، مگر ایک چیز جو سب میں مشترک ہے وہ ہے صاحب سوانح اور مصنف کی ذات، ایک طرح سے یہ اظہار ذات کا ایک وسیلہ ہے، اور یہی اظہار ذات بعض صورتوں میں خودشناسی سے شروع ہو کر خداشناسی تک جا پہنچتا ہے۔

اسلامی ادب میں ذرائع ابلاغ کی اہمیت اور اس کے اسلامی اصول واقدار

ابلاغ کا مفہوم

ابلاغ کا مفہوم خود اس کے لفظ سے ظاہر ہے کہ اس کا کام ''پہونچانا'' ہے، عربی میں اس کے لئے لفظ ''اعلام'' استعمال ہوتا ہے، انگریزی میں بھی اس کے لئے جو لفظ استعمال ہوتا ہے، اس کے معنی ''اطلاع دینا'' یا ''پہونچانا'' ہے۔ اس کا مقصد روزمرہ پیش آنے والے حالات وواقعات کی خبر دینا ہے، ذرائع ابلاغ کا اطلاق کتاب وصحافت نیز ترقی یافتہ جدید ذرائع مثلاً ریڈیو، ٹیلی ویژن اور انٹرنیٹ وغیرہ پر ہوتا ہے۔

مندرجہ بالا اصطلاحات اور ان کی تعریف ومفہوم پر اہل زبان وادب اور اہل علم کا اتفاق ہے اور تمام انسانی معاشرہ اس پر عمل پیرا ہے۔

یورپ کا دجل وفریب اور ذرائع ابلاغ کا غلط استعمال

یورپ نے عہد جدید میں (جس کو دین واخلاق کے خلاف بغاوت وانقلاب کا عہد کہا جاتا ہے) ایسا طریقہ اور اسلوب اختیار کیا ہے جو الفاظ کی حقیقت اور ان کے متعین مفاہیم کے خلاف ہے، مذکورہ بالا الفاظ کا استعمال ایسے موقعوں پر ہونے لگا جس کے لئے وہ وضع نہیں کئے گئے تھے، اس بے محل استعمال کا آغاز سب سے پہلے اس وقت ہوا جب علم کو اس کے اصلی مفہوم کے بجائے دوسرے معنی میں استعمال کیا گیا، یورپ جس نے بحث وتحقیق

کے میدان میں غیر معمولی ترقی، حقیقت پسندی اور خالص علمی ومعروضی اور غیر جانبدارانہ اسلوب کے دعوے کے باوجود جب کہ اس نے سائنس اور ٹکنالوجی کے میدان میں نئی نئی جہتیں تلاش کرلی ہیں، جہالت میں یا تجاہل عارفانہ سے کام لے رہا ہے اس کا رویہ دوسری قوموں کے علوم وفنون خصوصاً مسلمانوں کے علوم وفنون اور ان کی تہذیب وثقافت کے تئیں تحریف وتزویر اور حقائق کو مسخ اور توڑ مروڑ کر پیش کرنے کا ہے، یورپ نے ایسے ریسرچ سینٹرز، تحقیقی ادارے قائم کئے ہیں جو ایسی کتابیں شائع کرتے ہیں جو دوسری قوموں کے بارے میں تغافل وتجاہل، جعل سازی، دجل وفریب بلکہ جھوٹ اور گمراہ کن بیانات ومعلومات سے پر ہیں، یورپین مورخین نے جو بحث وتحقیق کے میدان میں مشہور ہیں، سیرت نبوی، اسلامی تاریخ اور اسلامی تہذیب وتمدن کے موضوع پر ایسی کتابیں تصنیف کی ہیں جو غلط بیانات اور زہریلے مواد پر مشتمل ہیں ان مصنفین کے بارے میں علمی کم مائیگی اور ناواقفیت کا عذر پیش نہیں کیا جاسکتا کیونکہ چہار دانگ عالم میں ان کے علم وفضل کا شہرہ ہے اور بحث وتحقیق کے میدان میں ان کی علمی عظمت، تحقیقی مزاج کا زمانہ معترف ہے لیکن اس کے باوجود ان مصنفین اور مورخین نے اسلام کے تعلق سے اپنی کتابوں میں ایسی معلومات پیش کی ہیں جن کو عقل وذہن قبول نہیں کرتا، حد تو یہ ہے کہ بعض مستشرقین نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق گھٹیا، گندے اور بازاری الفاظ استعمال کئے ہیں حالانکہ دشمن بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو امین صادق جیسے القاب سے ملقب کرتے تھے اور اپنے جھگڑوں میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم بناتے تھے، لیکن مستشرقین نے آپ کی شان میں ایسے گستاخانہ الفاظ استعمال کئے ہیں جنہیں رہزنوں، بدمعاشوں اور دھوکہ بازوں کے لئے بھی استعمال کیا جانا پسندیدہ نہیں سمجھا جاتا، یہ سب اسلام اور مسلمانوں سے بغض وحسد ونفرت کی وجہ سے حقائق کو تبدیل کرنے کی ایک کوشش ہے، ان مستشرقین نے اس سلسلہ میں اپنے ان ناپختہ ذہن اسلاف کی پیروی کی ہے جنہوں نے مسلمانوں ہی سے کسب فیض کیا اور مسلمانوں ہی سے علوم وفنون حاصل کئے، لیکن ان لوگوں نے بجائے اس کے کہ مسلمانوں کے احسان شناس

ہوتے ان کے ساتھ معاندانہ اور جانبدارانہ رویہ اختیار کیا اور اسلام اور مسلمانوں کے خلاف بغض وعداوت کا ماحول تیار کیا۔

شر وفساد کا ذریعہ

یورپ نے جس طرح ادب اور ثقافت کو اپنی فکر اور طرز زندگی کی اشاعت اور ترویج کا ذریعہ بنادیا ہے اسی طرح ذرائع ابلاغ کو بھی اپنے ان مقاصد کے لئے استعمال کررہا ہے، اس کے ساتھ میڈیا پر یہودی کنٹرول نے اس کے مضر اثرات میں اور اضافہ کردیا ہے، میڈیا کی تاثیر ادب اور علم کی تأثیر سے زیادہ محیط ہے، اس لئے کہ وہ جغرافیائی حدود کی پابند نہیں، ادب اور علم کی تاثیر محدود اور شخصی یا قومی ہے، میڈیا کی تأثیر عالمی ہے، جو لوگ مغربی ادبی نظریات ورجحانات کا مطالعہ کرتے ہیں، وہ بخوبی جانتے ہیں کہ مغربی ادب ولٹریچر، فضائل اور اچھائیوں کے بجائے رذائل اور برائیوں کا ذریعہ بن گیا ہے، اور خیر وصلاح، تعمیر واصلاح کے بجائے شر وفساد اور تخریب کے لئے استعمال کیا جاتا ہے اور اجتماعی اقدار وروایات کی ادب ولٹریچر کی راہ سے دھجیاں اڑائی جاتی ہیں، یہ سب انسانی اخلاق وکردار کی تشکیل کرنے والے اور بنی نوع انسان کو بلند اقدار وروایات کا درس دینے والے دین وتعلیمات سے بغاوت کا نتیجہ ہے۔

مفاد پرستی نے زندگی کے ہر شعبہ میں ذاتی منفعت اور شخصی اغراض ومفادات کی تکمیل کا رجحان پیدا کیا ہے، حالانکہ یورپ اجتماعی زندگی کی دعوت دیتا ہے اور اجتماعیت کو موجودہ تہذیب وتمدن کی بنیاد قرار دیتا ہے، لیکن مصلحت پرستی نے مغربی سماجی زندگی کے ہر شعبہ کو خودغرضی، اور ذاتی منفعت کا تابع بنادیا ہے، اور حقیقت اجتماعیت کے بجائے اس میں انفرادیت کا رجحان پیدا ہوگیا ہے۔

مغربی میڈیا کی تخریب کاری

میڈیا علم وفن اور ادب کا مجموعہ ہے اگر تصور حیات اور نظریہ زندگی کے بدلنے سے علم

وفن اورادب میں کوئی تبدیلی رونما ہوتی ہے تو طبعی طور پر انفارمیشن میڈیا میں بھی تبدیلی رونما ہوتی ہے، ذاتی منفعت اور شخصی مفادات کے غلبہ کی وجہ سے میڈیا صحیح اور مطابق حال خبریں بہم پہونچانے کے بجائے گمراہ کن واقعات اور خلاف واقعہ خبریں پیش کرنے کا آلہ بن گیا ہے، چنانچہ آج ظالم کو مظلوم، قاتل کو مقتول اور مجرم کو ایسا معصوم بنا کر پیش کیا جاتا ہے کہ گویا ساری رحمت وشفقت اور رحم وکرم کا وہی مستحق ہے، یہ میڈیا ہی ہے جس میں بڑے بڑے شاطر، مافیا، غنڈے اور انسانیت سوز جرائم کا ارتکاب کرنے والوں کو امن کا پیامبر بنا کر پیش کیا جاتا ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ مقاصد کو اگر وسائل سے الگ کر دیا جائے، اور مقاصد کے تصور کو بدل دیا جائے تو یہ اسکا لازمی نتیجہ ہوگا۔

دروغ گوئی

موجودہ ذرائع ابلاغ کا اگر جائزہ لیا جائے تو یہ حقیقت نہایت واضح طور پر نظر آجائے گی، سامراجی عہد سے اب تک کی تاریخ میں جابجا اس معنوی تحریف اور الٹی گنگا کی مثالیں موجود ہیں۔ بے شمار قومیں اس معنوی تحریف اور قلب حقائق کی وجہ سے ظلم وجور، سفاکی وخونریزی اور قہر وبربریت کا نشانہ بنیں، بارہا اس معنوی تحریف نے انسانیت کو مالی واخلاقی حیثیت سے مفلس وقلاش بنایا ہے ایسی تاریخی کتابیں تیار کی گئیں جو ان قوموں کی حقیقی تاریخ سے جداگانہ ہیں، جس کی وجہ سے یہ قومیں غلط بیانی اور سراسر جھوٹ اور دروغ گوئی کیوجہ سے صدمات اور بحرانوں سے دوچار ہوئی ہیں۔

موجودہ میڈیا

معاصر میڈیا کی حیثیت اس کے مالکوں کے حق میں ایک مدد ومعاون کی ہے وہ مخالفین کے لئے تیشہ سے کم نہیں، تمام ذرائع نشر واشاعت اپنے مالکوں کے مفادات ومنافع کے مطابق اچھے کو برا اور برے کو اچھا بنا کر پیش کرنے میں مصروف ہیں اور شخصی مصالح کی حفاظت اور ذاتی مفادات کو بروئے کار لانے کے لئے اخلاق تو اخلاق انسانی قدروں کو بھی پامال کیا جارہا ہے۔

پندرہویں صدی ہجری سے پہلے عالمی میڈیا نے یہ زبردست پروپیگنڈہ کیا کہ نئی صدی اسلام کی صدی ہوگی، اسلام کی بڑھتی ہوئی مقبولیت کے تعلق سے یہ اشتعال انگیز تصور اتنا فروغ پایا کہ پورا یورپ اسلام سے لرزنے لگا اور اس کے مقابلے کے لیے تیاری کرنے لگا۔

عالمی میڈیا کا رویہ

عالمی میڈیا نے اشتراکیت کو چھوڑ کر اسلام کے خلاف محاذ قائم کر کے عالم اسلام میں رونما ہونے والے واقعات وحوادث کو بڑھا چڑھا کر پیش کرنے پر پوری توجہ صرف کرنا شروع کردی، حالانکہ دوسری قوموں میں رونما ہونے والے دہشت گردانہ واقعات کا تناسب زیادہ ہے، خود یورپ میں کثرت سے انتہا پسندانہ اور دہشت گردانہ واقعات ہوتے رہتے ہیں لیکن میڈیا کو کوئی جنبش نہیں ہوتی لیکن اس کے مقابلہ میں عالم اسلام میں اگر کوئی چھوٹا واقعہ بھی پیش آجائے تو مغربی میڈیا اس کو انتہائی بھیانک شکل میں پیش کرتا ہے، اور اسلامی تنظیموں کی سرگرمیوں کو مائکراسکوپ سے دیکھ کر مسخ کر کے پیش کرتا ہے۔ ایسی رپورٹیں شائع کی جاتی ہیں جن میں پروپیگنڈہ، دجل وفریب، جعل سازی کی چھاپ غالب ہوتی ہے۔ اسی عرصہ میں ''تہذیبوں کا ٹکراؤ'' کے عنوان سے ایک کتاب شائع ہوئی تو عالمی میڈیا نے اس پر بھرپور توجہ دی جیسے وہ کوئی مقدس کتاب ہو اور اس کی معلومات ایسی صحیح اور مسلم ہوں جس میں کسی قسم کے اختلاف کی گنجائش نہ ہو۔

اسلامیت ومغربیت کی کشمکش اور اس کے ذرائع دفاع کا پتہ لگانے کے لیے کانفرنسیں منعقد کی گئیں اور کمیٹیاں تشکیل دی گئیں اور دوسری طرف کسی نے مطلق توجہ نہ دی کہ اسلامی تہذیب ہی وہ معاشرتی تہذیب ہے جس کی کوئی حکومت حامی ومعاون نہیں جب کہ مغربی تہذیب کی حفاظت کرنے والی ایسی بے شمار حکومتیں ہیں جو طاقت وقوت سائنس وٹکنالوجی اور ابلاغ کے وسائل سے لیس ہیں لیکن میڈیا نے اسلامی تہذیب کو عالمی خطرہ کی شکل میں

پیش کیا جس سے بڑی حکومتوں کے وجود کو خطرہ لاحق ہو گیا بلکہ پورا یورپ لرز اٹھا میڈیا کے اسلامی خطرہ کو سنگین بنا کر پیش کرنے کی وجہ سے دنیا کے مختلف حصوں میں قتل و غارت گری کے واقعات رونما ہوئے جن میں مسلمانوں کا بڑا جانی و مالی نقصان ہوا ان پر پابندیاں عائد کی گئیں اسی پروپیگنڈہ کی وجہ سے ''سویت یونین'' کی سابق اسلامی جمہوریتوں میں مسلمانوں کو وہ آزادی نہ مل سکی جو غیر مسلم ملکوں کو حاصل ہوئی اس لئے کہ میڈیا نے یہ زبردست پروپیگنڈہ کر رکھا تھا کہ مسلمانوں کی آزادی پورے یورپ کے لئے خطرہ ہے۔ اسی خطرہ کو بنیاد بنا کر بوسنیا، ہرزے گوینا اور سراجیو میں مسلمانوں کا قتل عام ہوا۔

ذرائع ابلاغ صہیونی شکنجہ میں

یہودیوں کے دست تصرف میں جو میڈیائی ادارے اور مراکز تھے وہ تو اور زیادہ اسلام دشمن تھے یہ یہودی اور صہیونی ادارے عالمی میڈیا پر کنٹرول رکھتے ہیں میڈیا کے تعلق سے یہودیوں کا موقف معلوم و مشہور ہے، ۱۸۶۹ء میں یہودی حاخام ''راشورون'' نے پراگ میں میڈیا پر کنٹرول حاصل کرنے کی ضرورت پر زور دیتے ہوئے کہا:۔

''دنیا پر کنٹرول کے لئے اگر سونے کے ذخائر پر قبضہ ہمارا پہلا ترجیحی ذریعہ ہے تو میڈیا دوسرا ذریعہ ہے''۔

۱۸۹۷ء میں تھیوڈر ہرٹزل نے سوئزرلینڈ کے شہر ''بال'' میں کہا کہ ''اسرائیل کا قیام اس وقت تک ممکن نہیں جب تک کہ ان کا میڈیا خاص طور پر صحافت پر مکمل قبضہ نہ ہو جائے''۔

حکماء صہیون کے پروٹوکول نمبر ۱۲ میں درج ہے:

پریس کو ہم اس طرح کنٹرول کریں گے:

''صحافت کو ہم اپنے قابو میں کریں گے اس طرح کہ وہ ہماری مرضی کے مطابق چلے''

''ہمارے دشمن کو اس میں دخل نہ ہوتا کہ وہ اپنی بات نہ کہہ سکے''

''کوئی بھی خبر ہمارے وسائل وذرائع ابلاغ سے بچ کر عوام تک نہ پہونچے''

''ہمارے اپنے اخبارات ہوں، وہ جس کی تائید کریں وہ ظاہر ہو، جس کی مذمت کریں وہ ذلیل ہو، جس نظام کو ہم پسند کریں عوام بھی اس کو پسند کریں، اور جس کو ناپسند کریں عوام بھی اس کو ناپسند کریں، ہم جب چاہیں فتنہ وفساد پیدا کردیں، جس فتنہ کو دبانا چاہیں اس کو دبا سکیں''

''اس کام کے لئے ضروری ہے کہ ایسے لوگ صحافت میں داخل کئے جائیں جن کا کوئی کیرکٹر نہ ہو، وہ ہمارے تابع ہوں، اور جب وہ اپنی رائے ظاہر کرنا چاہیں جو ہمارے مفاد کے خلاف ہو تو ہم ان کو بدنام کرکے عاجز کردیں''۔

اسلام پر میڈیا کی یلغار

مغربی میڈیا کے اس موقف کی وجہ سے دنیا میں کہیں بھی کوئی بم دھماکہ ہو، یا دہشت گردی کے واقعات اور کارروائیاں ہوں مسلمانوں کو اس کا ذمہ دار ٹھہرایا جائے، تاکہ پوری دنیا مسلمانوں کی مذمت کرنے لگے اور اسلام کے بارے میں غلط تصور قائم کرلے، دنیا کے کسی بھی حصہ میں کسی بھی وقت کوئی حادثہ پیش آتا ہے تو عالمی میڈیا بغیر کسی تحقیق کے مسلمانوں کو ہی مجرم گردانتا ہے، چنانچہ حادثہ کے فوراً بعد مسلمانوں پر ظلم وزیادتی کا پہاڑ توڑا جانے لگتا ہے، ''اوکلاھوما'' کے واقعات اس کی زندہ مثالیں ہیں جن کی تحقیق کے بعد معلوم ہوا کہ مسلمانوں کا اس میں دور تک کوئی ہاتھ نہیں تھا، اور اصل میں اس کا مجرم ایک یورپین عیسائی تھا۔ امریکہ کے ۹/۱۱ کے بارے میں اسی طرح کی رپورٹیں اور خود امریکی دانشوروں کی تحقیقات ہیں، لیکن مغربی میڈیا سرکاری بیان ہی کو مسلسل نقل کرتا رہتا ہے، عالمی میڈیا کا یہ اب مزاج بن گیا ہے کہ ہر تشدد کے واقعہ کو اسلام اور مسلمانوں سے جوڑے اور اس کے نتیجہ

میں بے قصور مسلمان ملزم قرار دئے جاتے ہیں اور طویل مدت تک عذاب میں مبتلا رہتے ہیں، بعض خوش قسمت عدالت میں بری قرار دئے جاتے ہیں، مگر اس وقت تک کی ان کی زندگی اور ان کا خاندان تباہی کا شکار ہو چکا ہوتا ہے۔

اس سیاسی پروپیگنڈہ کے ساتھ ساتھ معاصر یورپین میڈیا سماج میں تہذیب جدید کے عنوان سے فواحش و منکرات، اور حیا و اخلاق سوز باتوں کو رواج دیتا ہے اور یہ پروپیگنڈہ کرتا ہے کہ اسلام عورتوں کے ساتھ ظلم کرتا ہے اور انسانوں کے بنیادی حقوق اور آزادی سلب کرنا چاہتا ہے۔

ذرائع ابلاغ کی طاقت

موجودہ دور میں ذرائع ابلاغ نے جو طاقت حاصل کر لی ہے وہ جغرافیائی حدود سے بالاتر ہے۔ آج ملکوں اور قوموں کی تقدیریں نوک قلم سے وابستہ ہوگئی ہیں اور صحافت ملتوں اور قوموں کا مزاج بناتی اور بگاڑتی ہے۔ حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ کو جس طرح ادب کی تعمیری اور تخریبی طاقت اور صلاحیت کا احساس تھا اور اس کو صحیح مقاصد کی طرف متوجہ کرنے کی فکر تھی، اسی طرح ذرائع ابلاغ جو ادب ہی کی طرح تأثیر اور ذہن کی تشکیل کی صلاحیت رکھتے ہیں، اس کی اصلاح اور اس کے اہم کردار کی طرف متوجہ کرنے کی فکر تھی اور اس کے لئے انہوں نے ادب اسلامی کی تحریک کے ساتھ ساتھ کوشش کی تھی۔ حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی رحمۃ اللہ نے اردو ایڈیٹرز کانفرنس (۱۹۷۹ء) سے خطاب کرتے ہوئے کہا تھا:۔

> ''میں اس وقت آپ سے جو کچھ کہنا چاہتا ہوں اس کی ترجمانی کے لئے میرے پاس جگر مرادآبادیؒ کے اس شعر سے بہتر کوئی ذریعہ نہیں، وہ کہتے ہیں:
>
> کامل رہبر، قاتل رہزن دل سا دوست، نہ دل سا دشمن
>
> انہوں نے یہ شعر دل کے متعلق کہا ہے، میں صحافت کو بھی اس کا صحیح مصداق سمجھتا ہوں، آپ کا قلم دو دھاری تلوار ہے، جس سے آپ تخریب کا کام بھی لے سکتے ہیں اور تعمیر کا بھی۔

آج ملکوں اور قوموں کی تقدیریں نوک قلم سے وابستہ ہوگئی ہیں، قلم کی ایک غلطی اور اس کے غلط استعمال سے اسی طرح ملک کے ملک تاراج اور بستیوں کی بستیاں بے چراغ ہوجاتی ہیں، آپ کو اپنے قلم کی طاقت اور اس کے صحیح اور غلط استعمال کے نتائج کا پورا تجربہ ہے پہلے کسی کہنے والے نے کہا تھا ''زیرِ قدمت ہزار جانست'' آج تھوڑی ترمیم کے ساتھ آپ سے یہ کہنا صحیح ہوگا کہ ''زیرِ قلمت ہزار جانست۔

اگر اخبار نویس اپنے قلم کو احتیاط کے ساتھ استعمال نہ کریں، ان سے جذبات کے بھڑکانے، نفرت کو بڑھانے اور اشتعال پیدا کرنے کا کام لیں، تو ملی اور اجتماعی مزاج برہم، غیر معتدل، اشتعال پذیر اور غضبناک ہوتا ہے، پوری کی پوری قوم اور ملک کی آبادی تنک مزاج، غیر متحمل اور قوت برداشت سے محروم ہوجاتی ہے، وہ روئی کی طرح ایک منٹ میں آگ پکڑ لیتی ہے، اگر صحافت سے شعور کی بیداری، اخلاقی تربیت، حقیقت پسندی اور صبر وضبط پیدا کرنے کا کام لیا جائے تو قومی مزاج معتدل اور متحمل ہوتا ہے، اس کو ہر بات سننے، دیکھنے، غور کرنے اور حقیقت کو سمجھنے کی عادت پڑ جاتی ہے، اور وہ قوم کبھی بے اعتدالی اور بے راہ روی کا شکار نہیں ہوتی۔

آپ کے ہاتھ میں جو چیز ہے وہ کامل رہبر بھی ہوسکتی ہے اور قاتل رہزن بھی ہوسکتی ہے۔ یہ قلم بعض اوقات قوموں کی عزتوں اور آبروؤں سے کھیلتا ہے، اس لئے ہم کو اپنی ذمہ داری کا پورا احساس ہونا چاہئے''۔ (تعمیر حیات، شمارہ نمبر ۱۵، جلد نمبر ۱۶، ۱۰ر جون ۱۹۷۹ء)

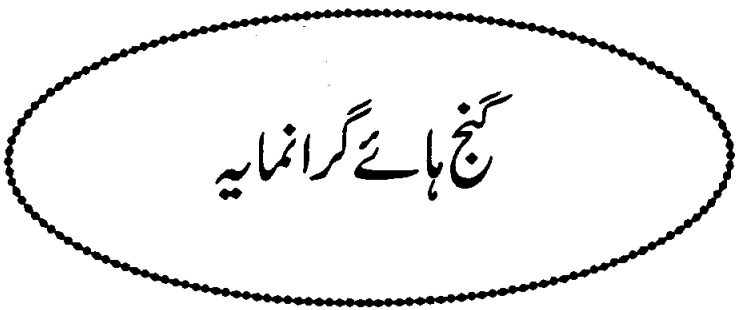
گنج ہائے گرانمایہ

اردو زبان پر اسلامی اثرات

اردو زبان

اردو زبان دنیا کی دیگر زبانوں سے بہت سے امور میں مختلف ہے جن میں پہلا اور بنیادی اختلاف یہ ہے کہ اردو زبان ایک جدید زبان ہے جس کی عمر تین سو سال سے زیادہ نہیں، یہ مغلوں کے آخری دور میں پنپی، پھلی پھولی اور ترقی یافتہ زبان بنی، یہ وہ دور تھا جب کہ ابھی اقتدار مسلمانوں کے ہاتھ میں تھا اور ان کا کلچر ہی رائج وغالب کلچر تھا، دوسرا اختلاف یہ ہے کہ اس زبان نے اپنے لغوی اور فکری سرمایہ میں ترکی، فارسی، عربی، ہندی اور سنسکرت جیسی دیگر زبانوں سے کافی مدد لی ہے، اور ان زبانوں کے الفاظ حسب ضرورت اس میں منتقل ہوئے اور ان سب کے اختلاط وآمیزش سے اردو زبان عالم وجود میں آئی، اس کی کتابت میں فارسی رسم الخط اختیار کیا گیا، پھر دوسری زبانوں سے منتقل ہونے والے الفاظ اردو میں آکر ہندوستانی ماحول میں ڈھل گئے، اور انہوں نے ہندوستانی لب ولہجہ اور اسلوب اختیار کرلیا اور ان پر یہاں کا مقامی رنگ چڑھ گیا۔

اردو زبان کا ارتقاء اور مسلم سلاطین وامراء

اردو زبان مسلمانوں کے دورِ عروج وعہدِ قوت وسطوت میں اور اسلامی ماحول کے برتری وبالادستی کی فضا میں پروان چڑھی، خاص طور پر شمالی ہند اور دکن کی اسلامی ریاستوں میں اس کو زیادہ برگ وبار حاصل ہوا، جس کے نتیجہ میں اس زبان پر اسلامی رنگ پختہ ہوا اور اس پر اسلامی ثقافت کی چھاپ پڑی، اور اسلامی تعبیرات واصطلاحات زبان کے بنیادی

اجزاء قرار پائے، مولانا حکیم سید عبدالحی حسنیؒ اپنی کتاب ''اسلامی علوم وفنون ہندوستان میں'' میں اردو زبان کی پیدائش اور نشو ونما کی تاریخ پر روشنی ڈالتے ہوئے فرماتے ہیں:

''ہندوستان کی اصل زبان سنسکرت ہے، اور ہندوؤں کے عقیدہ کے مطابق اس زبان میں ان کی چار آسمانی اور مقدس کتابیں ہیں لیکن روزمرہ اور عام بول چال کی زبان دوسری ہے، جو ہندوستان کے بڑے حصہ میں بولی جاتی ہے اور اس کو ''بھاشا'' کہتے ہیں، جب ہندوستان میں اسلام کی اشاعت ہوئی اور عرب وعجم سے یہاں مسلمانوں کی آمد ہوئی تو عربی، فارسی، ترکی اور ہندی زبانوں کے اختلاط وآمیزش سے ایک نئی زبان پیدا ہوئی اور اس کو ''اردو'' کہا جاتا ہے، یہ زبان بتدریج ترقی کرتی رہی، یہاں تک کہ شاہ جہاں کے زمانہ میں یہ فصاحت وبلاغت کے اچھی معیار پر پہنچ گئی، ابتدا میں دہلی اور اس کے اطراف کے لوگوں کا میلان فارسی شاعری کی طرف تھا، اور اردو شاعری میں شعر گوئی کا رجحان نہیں تھا، بیجاپور کے ابراہیم عادل شاہ کو موسیقی اور ہندی زبان سے بہت گہرا تعلق تھا، اور اس نے ہندی زبان میں کچھ کتابیں بھی تصنیف کی ہیں، اس کے پاس اس کے زمانہ کے علوم ومعارف کا بڑا حصہ جمع ہوگیا تھا، اور لوگ اس سے فائدہ اٹھاتے تھے، یہ حالت ابراہیم عادل شاہ کے لڑکے محمد عادل شاہ اور پھر ان کے لڑکے علی عادل شاہ کے زمانہ تک قائم رہی، علی عادل شاہ کو اردو زبان سے بڑی دلچسپی تھی، اس لئے اس کے زمانہ میں لوگ اس زبان کی طرف زیادہ مائل ہوئے، اور اس زبان میں اشعار کہنا شروع کیا''۔

اور محمد حسین آزاد ''آب حیات'' میں اردو کی ابتدائی تاریخ بیان کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

''ادھر تو یہ چونچال لڑکا (اردو) شعراء کے جلسوں میں اور امراء کے درباروں میں اپنے بچپنے کی شوخیوں سے سب کے دل بہلا رہا تھا، ادھر دانائے

فرنگ جو کلکتہ میں فورٹ ولیم کے قلعہ پر دوربین لگائے بیٹھا تھا، اس نے دیکھا، نظر باز تاڑ گیا کہ لڑکا ہونہار ہے، مگر تربیت چاہتا ہے، تجویز ہوئی کہ جس ملک پر حکمرانی کرتے ہیں اس کی زبان سیکھنی واجب ہے، چنانچہ ۱۷۹۹ء (۱۲۱۴ھ) میں میر شیر علی افسوس نے ''باغ اردو'' اور ۱۸۰۵ء (۱۲۲۰ھ) میں ''آرائش محفل'' لکھی، میر امن دہلوی نے ۱۸۰۲ء (۱۲۱۷ھ) میں ''باغ و بہار'' آراستہ کیا، اور انہی دنوں میں ''اخلاق محسنی'' کا ترجمہ لکھا، ساتھ ہی جان گلکرسٹ صاحب نے انگریزی میں ''قواعد اردو'' لکھی۔.....اب عام فہم اردو ہو کر ناگری میں لکھی گئی، لیکن اس نقارۂ فخر کی آواز کو کوئی دبا نہیں سکتا کہ میر انشاء اللہ خاں پہلے شخص ہیں جنہوں نے ۱۸۰۷ء (۱۲۲۲ھ) میں قواعد اردو لکھ کر ایجاد کی ٹہنی میں ظرافت کے پھول کھلائے''۔

آگے مزید لکھتے ہیں:

''عجیب لطف یہ ہے کہ زبان اردو کی عام فہمی دیکھ کر مذہب نے بھی اپنی برکت کا ہاتھ اس کے سر پر رکھا، یعنی ۱۸۰۷ء-۱۲۲۲ھ میں مولوی شاہ عبدالقادر صاحب نے قرآن شریف کا ترجمہ اردو میں، بعد اس کے مولوی اسماعیل صاحب نے بھی بعض رسالے عام اہل اسلام کی فہمائش کے لیے اردو میں لکھے''۔

''۱۸۳۵ء سے دفاتر سرکاری بھی اردو ہونے شروع ہوئے، چند سال کے بعد کل دفتروں میں اردو زبان ہوگئی، اسی سنہ میں اخباروں کو آزادی حاصل ہوئی، ۱۸۳۶ء میں اردو کا اخبار دلی میں جاری ہوا اور یہ اس زبان میں پہلا اخبار تھا.....اور ۱۸۴۲ء سے دلی میں سوسائٹی قائم ہو کر ترجمے ہونے لگے''۔

(آب حیات صفحہ: ۲۴-۲۵)

محمد اکرام صاحب لکھتے ہیں:

''ان کی (یعنی مولانا اسماعیل شہید رحمۃ اللہ علیہ کی) اہم ترین کتاب

''تقویۃ الایمان'' ہے، جوانہوں نے اردو زبان میں اس وقت لکھی جب اس زبان کو ابھی گھٹنوں چلنا نہیں آتا تھا، حیرت ہوتی ہے کہ اس زمانہ میں جب اردو نثر میں گنتی کی کتابیں تھیں ایک صاحب کمال نے اس میں کیا جادو بھر دیا ہے، اور اس کی مدد سے اپنے خیالات کو کتنی خوبی سے ادا کیا ہے''۔

(موج کوثر صفحہ:۳۸)

اردو زبان کی ترویج میں مصلحین اور علماء ربانیین کا حصہ

اردو زبان کا تخم پہلے اسلامی لشکر کی زمین میں بویا گیا، پھر اس کی نشو ونما دہلی اور دکن کے اسلامی شاہی درباروں میں ہوئی، پھر اس کو رائج وعام فہم اور مقبول بنانے میں مصلحین امت، علمائے ربانیین اور ان کے شاگردوں اور مریدوں نے حصہ لیا اور اسلامی موضوعات پر نثر ونظم کی اولین کتابیں اسی زبان میں لکھی گئیں۔

اردو انسائیکلو پیڈیا میں لفظ اردو کی تشریح میں تحریر ہے کہ ابتدائی کتابیں جو اردو زبان میں لکھی گئیں، ان میں معراج العاشقین، شرح مرغوب المطلوب، شرح تمہید ہمدانی اور قرآن شریف کے ترجمے کی کتابیں ہیں۔

اردو نثر کی طرح اردو شاعری بھی اہل دل صوفیہ اور بزرگان دین کی گود میں پلی بڑھی، چنانچہ اردو شاعری پر امیر خسرو، مرزا مظہر جان جاناں کے اثرات سے تاریخ ادب اردو سے واقفیت رکھنے والا انکار نہیں کرسکتا، حکیم مومن خاں مومن اور خواجہ میر درد کا کلام بھی درد وسوز اور رقت وگداز کا شاہکار ہے، یہ دونوں حضرات علماء وصوفیہ اور بزرگان دین کے عقیدت مند وارادت کیش اور اسلامی جذبہ کے حامل شاعر تھے، خواجہ میر درد کئی کتابوں کے مصنف ہیں، ''اسرار الصلاۃ'' ان کا ایک رسالہ ہے جو پندرہ برس کے سن میں لکھا ہے، ''واردات درد'' نامی ایک دوسری کتاب ہے جس میں ایک سو گیارہ رسالے ہیں ''نالۂ درد'' ''آہ سرد'' ''درد دل'' ''سوز دل'' اور ''شمع محفل'' وغیرہ۔ اس کی شرح میں ''علم الکتاب'' جیسی

کتاب تصنیف کی، ایک رسالہ مبحث غناء میں لکھا ہے، ایک دیوان فارسی میں ہے اور ایک ریختہ میں۔ یہ ساری کتابیں مطبوعہ ہیں اور حکیم مومن خاں مومن جوانی میں سید احمد شہیدؒ کے مرید ہوئے اور آخر عمر تک عقائد میں انہی کے پیرو متبع رہے، کلیات میں ایک مثنوی جہاد یہ ہے جو اس وقت لکھی تھی جب سید صاحب سکھوں سے جہاد کر رہے تھے، علاوہ اس کے دو قطعۂ تاریخ ان کی امامت کے ہیں۔ شوق شہادت پر ان کا یہ شعر بہت مشہور ہے:

الٰہی مجھے بھی ہو شہادت نصیب
یہ افضل سے افضل عبادت نصیب

اسلامی چھاپ

اور اگر ہم مختلف ادوار میں حرف شناسی اور مکتب کی تعلیم سے لیکر دراسات علیا تک کے نصاب تعلیم کا جائزہ لیں تو معلوم ہوگا کہ اردو زبان اسلامی زبان ہے، اس لیے کہ بچہ جب الف با پڑھنا شروع کرتا ہے تو سب سے پہلا لفظ جو وہ سیکھتا ہے لفظ اللہ ہوتا ہے، کیونکہ وہ اپنی کتاب میں پڑھتا ہے: الف سے اللہ۔ اسی طرح بچہ اپنی مادری زبان اردو کی تعلیم کے دوران اسلامی نظمیں، ترانے اور اسلامی اخلاق و کردار بھی سیکھتا ہے۔

نیز اردو کی وہ تمام تعبیرات و کلمات بھی جن سے غرور و طاقت، محبت و شفقت اور خیر و شر کا اظہار ہوتا ہے، اسلامی الاصل ہیں، مثلاً تکبر کرنے والے کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ فرعون ہے، کثرت مال پر ناز کرنے والے کو قارون کہتے ہیں، اسی طرح کسی میں شرارت و خباثت کا غلبہ ہو تو اسے ابلیس اور شیطان کہتے ہیں، کوئی پیٹو اور زیادہ کھانے والا ہو تو کہتے ہیں اس کا پیٹ جہنم ہے، یا وہ شیطان کے پیٹ سے کھاتا ہے، بھوک کی شدت بتلانی ہو تو کہا جاتا ہے: آنتیں قل ھو اللہ پڑھ رہی ہیں، اس طرح اردو پڑھنے والا اور اردو بولنے والا اسلامی فضا اور اسلامی ماحول میں پروان چڑھتا ہے، حد سے زیادہ لمبائی بتلانے کے لئے شیطان کی آنت سے تعبیر کیا جاتا ہے، کسی کے حسن کردار و خوبیٔ اخلاق کی تعریف مقصود ہو تو

کہا جاتا ہے کہ وہ فرشتہ ہے، یا فرشتوں جیسا ہے یا اس کے اندر ملکوتی صفات پائی جاتی ہیں، اسی طرح کچھ تعبیرات اسلامی ثقافت و کلچر سے تعلق رکھتی ہیں جنہیں مسلم اور غیر مسلم سبھی استعمال کرتے ہیں، مثلاً ماشاءاللہ، سبحان اللہ، الحمدللہ، اور انشاءاللہ وغیرہ۔

ظاہر ہے کہ جب زبان وادب کا یہ مزاج ہو تو طبعی طور پر ادب کا رجحان بھی اسلامی ہوگا، اسی لئے اردو ادب میں فساد و بگاڑ اور اخلاقی انحراف کے عناصر کسی دوسری زبان کے مقابلہ میں کم پائے جاتے ہیں، اور اگر کسی دور میں اردو ادب میں انحراف آیا تو ایسے ادباء اس کے مقابلہ پر اترے جن کا اپنا ایک وزن تھا، اور ادب کی دنیا میں جن کا طوطی بولتا تھا، اردو ادب برابر اسلام، اسلامی شعائر اور اسلامی شخصیات کے ادب واحترام کی اس خصوصیت پر قائم رہا، یہاں تک کہ فکری یلغار کا دور آیا اور اس میں مارکسی ادب کے غلبہ کے دور میں دین کے ساتھ استہزاء کا عنصر داخل ہوگیا، جب کہ خدا بیزار و ملحد بالشویک انقلاب کے نتیجہ میں ترقی پسند اور روشن خیال ادب وجود میں آیا، اور بعض نام نہاد مدعیان ادب مغربی ادباء کی گود میں جا گرے۔ لیکن یوروپین تہذیب کے اس سیل بے اماں اور طوفان تند و جولاں اور عام انسانی زندگی پر اس کے اثر انداز ہونے کے باوجود ادباء و شعراء نے اسلامی اقدار کے احترام کی ہمیشہ پاسداری کی اور شاعری کی مختلف اصناف میں اسلامی بلکہ عربی تعبیرات کا استعمال کرتے رہے، یہی حال نثر کا بھی تھا، علامہ شورش کاشمیری کا قسط وار ناول جو رسالہ ''چٹان'' لاہور میں شائع ہوا وہ اس پر بخوبی روشنی ڈالتا ہے کہ اردو ادباء کی زندگیوں میں دین کا کتنا ادب واحترام پایا جاتا تھا۔

اردو ادب اور ملت اسلامیہ

اردو زبان وادب کی طویل تاریخ میں ہمیں ایسے ادباء بھی ملتے ہیں جنہوں نے اپنے ادب و شعر کو دین اور ملت اسلامیہ کی خدمت کے لیے وقف کر دیا تھا، یہی وطیرہ دیگر اصناف کلام تاریخ و ناول لکھنے والے ادباء کا بھی رہا، انہوں نے ان اصناف میں اپنی صلاحیتوں کا

استعمال اسلام مخالف افکار وخیالات پر تنقید، اسلامی خصائص کو اجاگر کرنے، دلوں میں اسلامی غیرت ابھارنے اور اسلامی فکر پیدا کرنے اور اپنے کمزور پہلوؤں یا قابل عبرت جگہوں کی نشان دہی کرنے کے لیے کیا، قابل عبرت مواقع پر ان کے قلم کی طاقت میں اضافہ ہوجاتا ہے، ان کی طبیعت میں ابال پیدا ہوتا ہے، اور ان کا جذبہ چھلک چھلک پڑتا ہے، ان کے قلم میں وہ تاثیر پائی جاتی ہے جو کسی جنگی قائد میں ہوتی ہے، جو پورے لشکر کو موت کی تاریک وادیوں میں کود پڑنے پر آمادہ کردیتا ہے، چنانچہ ادباء کے مضامین بھی اسی طرح پورے ماحول میں ایک آگ سی لگادیتے تھے، اور مسلم معاشرہ کو حرکت وعمل اور سختیاں برداشت کرنے پر آمادہ کردیتے تھے، جیسے شعرا کے اشعار دلوں میں اسلامی غیرت کی آگ بھڑکاتے تھے، اور مسلمانوں کو حرکت وعمل اور اصلاح احوال پر ابھارتے تھے، اور ان کے اندر اسلامی اور اسلامی تاریخ پر اعتماد کو بحال کرتے تھے، اور دلوں میں اسلامی تہذیب وثقافت کی محبت اور مغربی تہذیب کی نفرت جاگزیں کرتے تھے، اور مسلمانوں کی عظمت رفتہ کا ماتم کرتے تھے، جیسے خواجہ الطاف حسین حالی، علامہ اقبال، اکبر الہ آبادی، حفیظ جالندھری، شبلی نعمانی اور ظفر علی خاں وغیرہ، ان شعراء کے اشعار آج بھی برابر قلوب کو گرماتے ہیں، دلوں کو مہمیز لگاتے اور انہیں مست وبیخود بناتے ہیں، اور ان میں عزم ویقین پیدا کرتے ہیں، جو بھی اردو ادب کا جائزہ لے گا اس کے آئینہ میں مسلمانوں کی تاریخ کی جھلکیاں دیکھے گا، صرف برصغیر ہی نہیں؛ بلکہ پورے عالم کی تصویر اس میں نظر آئے گی۔ وہ دیکھے گا کہ اردو کے مسلمان ادیب اور مسلمان شاعر کا دل بے قرار وبے چین ہوجاتا ہے، جب ایرانی، ترکی یا عربی شخص پر کوئی افتاد پڑتی ہے، گویا وہ اسے اپنا درد سمجھتا ہے، اور اس کی زبان ایسے موقع پر امت اسلامیہ کی زبان اور اس کی ترجمان بن جاتی ہے۔ اس حالت کی بہترین تصویر کشی اور اس عالمی اسلامی مزاج کی شاندار عکاسی علامہ شبلی نعمانی کے وہ اشعار کرتے ہیں جو انہوں نے برطانوی حکومت کو مخاطب کرتے ہوئے کہے تھے جب کہ اس حکومت کے بعض وزراء نے یہ دعوی کیا تھا کہ برطانوی سیاست ہندوستانی مسلمانوں کے

حق میں عادلانہ ہے تو پھر ہندوستانی مسلمان دوسرے ممالک میں پیش آنے والے واقعات سے کیوں دلچسپی لیتے اور ان پر واویلا مچاتے ہیں۔

وہ کہتے ہیں کہ ہم کو پاس ہے احساس مسلم کا
مگر اس کا اثر جو کچھ ہے بس ہندوستان تک ہے
مگر ہم کیا کریں اس کو کہ عالمگیری ملت
عراق و فارس و نجد و حجاز و قیرواں تک ہے
منافق ہے جو کہتا ہے کہ ''میں ٹرکی سے یکسو ہوں''
یہ وہ الفاظ ہیں جن کی جہانگیری زباں تک ہے
ہمارا جوش اسلامی انہیں باور نہیں کرتا
یہ انداز تغافل جلوہ گاہ امتحاں تک ہے

ہندوستان میں مسلمانوں کے زوال اور ان کی بساط سیاست پلٹ جانے سے اردو ادباء وشعراء پر بہت زیادہ اثر پڑا، مغلیہ حکومت کا دار السلطنت اخیر دور میں مراٹھہ، سکھ اور افغان قبائل کی ترک تازیوں کے نرغہ میں تھا، آخر دار السلطنت تاخت وتاراج ہوا، مسلمانوں کی عزتیں پامال کی گئیں اور مکانات ومحلات اور کوچہ وبازار لوٹے گئے، اور یہاں بھی وہ واقعات پیش آئے جو عباسی خلافت میں بصرہ اور بغداد میں پیش آئے تھے، اور جس طرح ان واقعات نے عرب شعراء کے جذبات بھڑکائے تھے، اسی طرح ان واقعات نے اردو شعراء کے دلوں میں اشتعال پیدا کیا اردو ادب کا طالب علم یہ سلگتا ہوا جذبہ اردو شاعر خواجہ میر درد کے کلام میں پاتا ہے جنہوں نے ان حادثات کو خون جگر سے بیان کیا ہے، اور یہ جذبہ ہمیں آخری مغل بادشاہ بہادر شاہ ظفر کے کلام میں ملتا ہے جو اردو کے اولین باکمال شعراء میں تھے، اسی طرح ان کی جھلک ہمیں شاہ عبدالعزیز دہلوی اور مرزا مظہر جان جاناں کی تحریروں میں ملتی ہے، اور یہ رسالے اور قصائد اپنے اندر ایک دائمی تاثیر رکھتے ہیں اور اسلامی حمیت پیدا کرتے ہیں۔

اردو ادب اور قومیت اسلامیہ

جو شخص اردو ادباء کی تحریروں اور شعراء کے ان اشعار کا مطالعہ کرے گا جو یورپ کے خلاف ترکی کی لڑائیوں کے دوران کہے گئے تو وہ محسوس کرے گا کہ یہ ادباء ترکی میں رہ رہے ہیں اور ترکی ہی ان کا وطن ہے، ترکی کی کامرانیوں اور فتح مندیوں پر ان کے چہرے کھل اٹھتے اور اس کی شکستوں اور ناکامیوں سے ان پر حزن وملال کے بادل چھا جاتے ہیں، نیز وہ محسوس کرے گا کہ ہندوستانی مسلمان کا دل ہر اس واقعہ پر دھڑکتا ہے جو عالم اسلامی کے کسی بھی حصہ میں رونما ہوتا ہے، اور خاص طور پر جب وہ حادثہ کسی عربی، ایرانی یا ترکی علاقہ میں پیش آتا ہے، تو اس کا حزن وملال اور شدید ہو جاتا ہے اور اس کی بے چینی مزید بڑھ جاتی ہے۔

علامہ شبلی نعمانیؒ

جنگ بلقان وطرابلس سے متعلق علامہ شبلی نعمانیؒ کی ایک نظم ملاحظہ ہو، کہتے ہیں:

مراکش جاچکا، فارس گیا، اب دیکھنا یہ ہے
کہ جیتا ہے یہ ٹرکی کا مریض سخت جاں کب تک
یہ سیلاب بلا بلقان سے جو بڑھتا آتا ہے
اسے روکے گا مظلوموں کی آہوں کا دھواں کب تک
کوئی پوچھے کہ اے تہذیب انسانی کے استادو
یہ ظلم آرائیاں تا کے یہ حشر انگیزیاں کب تک
یہ مانا تم کو تلواروں کی تیزی آزمانی ہے
ہماری گردنوں پر ہوگا اس کا امتحاں کب تک
کہاں تک لوگے ہم سے انتقام فتح ایوبی
دکھاؤگے ہمیں جنگ صلیبی کا سماں کب تک
زوال دولت عثماں، زوال شرع و ملت ہے
عزیزو! فکر فرزند وعیال وخانماں کب تک

جو گونج اٹھے گا عالم شور ناقوس کلیسا سے
تو پھر یہ نغمۂ توحید وگلبانگ اذاں کب تک
کہیں اڑکر نہ دامان حرم کو بھی یہ چھو آئے
غبار کفر کی یہ بے محابا شوخیاں کب تک
حرم کی سمت بھی صید افگنوں کی جب نگاہیں ہیں
تو پھر سمجھو کہ مرغان حرم کے آشیاں کب تک
جو ہجرت کرکے بھی جائیں تو شبلی اب کہاں جائیں
کہ اب امن وامان شام ونجد وقیراں کب تک

ہندوستان کے مسلمان شعراء کا عربوں، ترکوں اور پوری دنیا کے مسلمانوں کے واقعات سے متاثر ہونا اوران کے مسائل سے دلچسپی لینا ایک عام اور مشترک بات ہے جس میں اردو کے سارے شعراء شریک ہیں، اور یہ رجحان مختلف مواقع پر ظاہر ہوتا ہے، اس کی دلیل یہ ہے کہ مسلمان اردو شاعر کا دل ہمیشہ اپنے غیر ہندوستانی مسلم بھائیوں کے ساتھ وابستہ اور اسلامی جذبہ سے لبریز ہوتا ہے، چنانچہ شاعر اسلامی آثار ونقوش کی عظمت کے گن گاتا ہے، اور کسی بھی مسلمان ملک میں پیش آنے والے واقعات پر خون کے آنسو روتا ہے خواہ اس ملک کی زبان اور اس کا کلچر کچھ بھی ہو۔

علامہ اقبال

یہ عالمی اسلامی جذبہ اپنی طاقت ور ترین شکل میں اقبال کے کلام میں دیکھا جاسکتا ہے، جنہوں نے امت عربیہ کو خطاب کیا، مسئلۂ فلسطین کا درماں سوچا، اندلس پر آنسو بہائے، اور قرطبہ اور جامع قرطبہ کی زیارت کے موقع پر وہ دلکش نظم کہی جو ان کی عمدہ ترین نظموں میں شمار ہوتی ہے، نیز وہ اپنے اشعار میں جابجا امام رازی، مولانا رومی، شیخ ابن عربی، حکیم بوعلی سینا اور امام غزالی جیسے دانشوران اسلام، مسلمان فلاسفہ اور مصلحین امت

کے حوالے دیتے ہیں اوران کی عظمت کے گن گاتے ہیں۔اقبال اپنے اندر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت کا بے پناہ جذبہ بھی رکھتے ہیں، جنہیں وہ رسول عربی کا لقب دیتے ہیں اور عربی کا لفظ بار بار لاتے ہیں اور اپنے کو مقامات مقدسہ کی زیارت کرتا ہوا اور وہاں کی فضاؤں میں پرواز کرتا ہوا تصور کرتے ہیں۔

اقبال اس بات کو کبھی فراموش نہیں کرتے کہ وہ اصلاً ہندوستانی بلکہ ہندو آباء وجداد ہیں، اوراپنے اشعار میں اسے بیان کرتے ہیں، قرطبہ سے متعلق اپنی نظم میں کہتے ہیں:

کافر ہندی ہوں میں، دیکھ مرا ذوق و شوق
دل میں صلاۃ و درود، لب پہ صلاۃ و درود
شوق مری لَے میں ہے، شوق مری نے میں ہے
نغمۂ اللہ ھو میرے رگ و پے میں ہے

اقبال اپنا اور مسجد کا موازنہ کرتے ہوئے کہتے ہیں:

تیری فضا دل فروز، میری نوا سینہ سوز
تجھ سے دلوں کا حضور، مجھ سے دلوں کی کشود
عرش معلّٰی سے کم سینۂ آدم نہیں
گرچہ کف خاک کی حد ہے سپہر کبود
پیکر نوری کو ہے سجدہ میسر تو کیا
اس کو میسر نہیں سوز و گداز سجود

مغربی تہذیب پر تنقید

اگرچہ اقبال کی نشو ونما اور تعلیم وتربیت مغربی ماحول اور وہاں کی فضاؤں میں ہوئی تھی، اورانہوں نے مغربی علوم میں کمال پیدا کیا اور مغربی ثقافت وکلچر سے متاثر بھی ہوئے؛ لیکن ان کی اسلامیت غالب آئی اور وہ مغرب کا حلقہ بگوش ہونے کے بجائے اس کے باغی

ہوئے، اور مغربی تہذیب کو اپنی کڑی تنقید کا نشانہ بنایا۔ ان کی تنقید و بغاوت کا نقطۂ آغاز اور باعث اسلامی ملکوں کے تئیں یورپ کے ظالمانہ اور اسلام اور مسلمانوں کے ساتھ اس کی عداوت پر ان کا ردِ عمل تھا، اگرچہ اقبال کے دور میں مسلمانوں سے انگریزوں کے انتقام لینے کی آندھی تھم چکی تھی؛ لیکن اقبال کے دل پر ہر اس واقعہ سے چوٹ لگتی تھی جو عالم عربی میں پیش آتا اور مغربی تہذیب کے اس خطرہ سے ان کا دل کڑھتا اور بے چین تھا جو اسلامی تہذیب کو لاحق تھا۔ کیونکہ اقبال نے فرنگی تہذیب کی بنیادی کمزوریوں، اس کے دبتے ہوئے پہلوؤں اور اس عنصری فساد اور بگاڑ کو دیکھ لیا تھا جو اس کی سرشت اور اس کی طینت میں موجود تھے۔

انہوں نے دیکھا کہ مغربی تہذیب سے متاثر ذہن مذہب اور اخلاقی و روحانی اقدار کے ساتھ کیسا معاملہ کرتا ہے، انہوں نے فساد قلب و نظر کو اس تہذیب کی روح کی ناپاکی کا ثمرہ بتایا ہے، جس نے اس سے قلب سلیم کی دولت چھین لی۔

فساد قلب و نظر ہے فرنگ کی تہذیب
کہ روح اس مدنیت کی رہ سکی نہ عفیف
رہے نہ روح میں پاکیزگی تو ہے ناپید
ضمیر پاک و خیال بلند و ذوق لطیف

آگے کہتے ہیں:

یہ عیش فراواں یہ حکومت یہ تجارت
دل سینۂ بے نور میں محروم تسلی
تاریک ہے افرنگ مشینوں کے دھوئیں سے
یہ وادیٔ ایمن نہیں شایان تجلی
ہے نزع کی حالت میں یہ تہذیب جواں مرگ
شاید ہوں کلیسا کے یہودی متولی

اکبر حسین الہٰ آبادیؒ:

اکبر حسین الہٰ آبادیؒ (۱۸۴۶ء - ۱۹۲۱ء) ان لوگوں میں تھے جنہوں نے ہندوستان میں انگریزوں کا دور عروج اور علوم جدید کا غلبہ دیکھا تھا، جب کہ مغربی تہذیب کا جادو سر چڑھ کر بول رہا تھا، اور ہندوستان میں مدرسۃ العلوم (حال مسلم یونیورسٹی علیگڑھ) کے بانی سرسید احمد خاںؒ کی قیادت میں مغربی تہذیب اور اسلامی ثقافت کے درمیان تال میل پیدا کرنے کی زبردست تحریک چل رہی تھی۔ اکبر الہ آبادیؒ خود بھی سرکاری اسکولوں کے تعلیم یافتہ اور علوم جدیدہ سے واقف تھے۔ عدالتی عہدوں اور مناصب پر بھی فائز رہے، انگریزی حکومت نے انہیں خان بہادر کا لقب بھی دیا تھا، اکبر اپنے دور کے اردو کے بڑے شعراء میں شمار ہوتے تھے، ان کے تین شعری مجموعے ادبی و اسلامی حلقوں سے خراج تحسین حاصل کر چکے ہیں اور مشہور ہیں، بڑے بڑے ادباء و شعراء ان کے کمال فن کے معترف ہیں، اور وہ اردو کی ظریفانہ اصلاحی شاعری کے امام تسلیم کیے جاتے ہیں۔

اکبر الہٰ آبادی نے مغربی تہذیب کو ترجیح دینے اور مغربی کالجوں میں تعلیم حاصل کرنے کے رجحان کا سختی سے مقابلہ کیا، اور زندگی بھر مغربی تہذیب پر تنقید ان کی شاعری کا موضوع رہا۔ یہاں تک کہ اردو انسائیکلو پیڈیا نے یہ کہتے ہوئے ان پر تنقید کی کہ انہوں نے مغربی تہذیب پر تنقید کرنے میں مبالغہ سے کام لیا ہے، حتی کہ انہوں نے ہر اس اصلاحی عمل اور مفید کوشش کو اپنی تنقید کا نشانہ بنایا ہے، جس میں مغربی افکار کے سرایت کر جانے کا خدشہ بھی انہیں محسوس ہوا۔

مغربی تعلیم و تہذیب اور مغربی افکار و خیالات پر تنقید کے سلسلہ میں اکبر الہٰ آبادی کے چند اشعار ملاحظہ ہوں، کہتے ہیں:

مغربی روش پر کیوں نہ آئیں اب قلوب
قوم ان کے ہاتھ میں تعلیم ان کے ہاتھ میں

شیخ مرحوم کا قول اب مجھے یاد آتا ہے
دل بدل جائیں گے تعلیم بدل جانے سے
قابلیت تو بہت بڑھ گئی ماشاء اللہ
مگر افسوس یہی ہے کہ مسلماں نہ رہے
تعلیم جو دی جاتی ہے ہمیں وہ کیا ہے فقط بازاری ہے
جو عقل سکھائی جاتی ہے، وہ کیا ہے فقط سرکاری ہے

تہذیب جدید میں سوائے مادہ پرستی اور ظاہر بینی کے کچھ نہیں، کہتے ہیں:

ہم کیا کہیں احباب کیا کار نمایاں کر گئے
بی اے ہوئے، نوکر ہوئے، پنشن ملی، پھر مر گئے
کل مست عیش و ناز تھے ہوٹل کے ہال میں
اب ہائے ہائے کر رہے ہیں اسپتال میں
ہوئے اس قدر مہذب کبھی گھر کا منہ نہ دیکھا
کٹی عمر ہوٹلوں میں مرے اسپتال جاکر
جو پوچھا دل سے اس جینے کا کیا مقصود آخر ہے
شکم بولا کہ اس کی بحث کیا خادم تو حاضر ہے
بتائیں آپ سے مرنے کے بعد کیا ہوگا
پلاؤ کھائیں گے احباب فاتحہ ہوگا

ڈارون کے نظریۂ ارتقائے آدم پر تنقید ملاحظہ ہو:

نیست کس مصروف کار دیں بقلب مطمئن
یک فنا فی الآنر است و یک فنا فی الدارون
ڈارون صاحب حقیقت سے بہت دور تھے
میں نہ مانوں گا کہ آباء آپ کے لنگور تھے

نئی تعلیم کو کیا واسطہ ہے آدمیت سے
جناب ڈارون کو حضرت آدم سے کیا مطلب
سرفرازی ہو اونٹوں کی تو گردن کاٹئے ان کی
اگر بندر کی بن آئے تو فیض ارتقاء کہئے

اورانگریزی اقتدار کے بعدقوم کی حالت کی تصویر کشی کرتے ہوئے کہتے ہیں:

نئی نئی لگ رہی ہیں آنچیں، یہ قوم پیکس پگھل رہی ہے
نہ مغربی ہے نہ مشرقی ہے، عجب سانچے میں ڈھل رہی ہے
وزن اب ان کا معین نہیں ہوسکتا کچھ
برف کی طرح مسلمان گھلے جاتے ہیں

اور یہ انداز بھی ملاحظہ ہو:

انہی کے مطلب کی کہہ رہا ہوں، زبان میری ہے بات ان کی
انہی کی محفل سنوارتا ہوں، چراغ میرا ہے، رات ان کی
فقط میرا ہاتھ چل رہا ہے، انہی کا مطلب نکل رہا ہے
انہی کا مضمون، انہی کا کاغذ، قلم انہی کا، دوات ان کی

اکبر الہ آبادی تنقید برائے تنقید کے قائل نہیں تھے، بلکہ انہیں مسلمانوں کو ان کی اسلامیت اور دینی غیرت پر قائم رکھنا مقصود تھا، چنانچہ فرماتے ہیں کہ تم ترقی جتنی چاہے کرو، سب روا ہے، بس ایک بات یاد رکھنا کہ اللہ کو اور اپنی اسلامیت کو فراموش مت کرنا:

تم شوق سے کالج میں پھلو پارک میں پھولو
جائز ہے غباروں میں اڑو چرخ پہ جھولو
بس ایک سخن بندۂ عاجز کا رہے یاد
اللہ کو اور اپنی حقیقت کو نہ بھولو

اردو شاعری غیرت اسلامی کی مثالوں سے بھری پڑی ہے، اور یہ غیرت مختلف شکلوں

میں ظاہر ہوئی ہے، کبھی تو مغربی تہذیب پر تنقید کی شکل میں، کبھی مسلمانوں کی عظمت رفتہ پر اظہار حسرت وافسوس اور تہذیب اسلامی کی تقدیس وثنا خوانی کی صورت میں، کبھی ان مشکلات ومصائب کی تصویر کشی کی شکل میں جن سے مسلمان دوچار تھے اور ہیں، اور کبھی تاریخ اسلامی کے گذشتہ کارناموں کے تذکرہ کی شکل میں، اس قبیل کی شاعری میں شیخ عبد الرزاق کلامی کی صمصام الاسلام، حفیظ جالندھری کی شاہنامۂ اسلام، خواجہ الطاف حسین حالی کی مسدس حالی اور اسلامی تعلیم وتربیت اور مسلمانوں کی پسماندگی وزبوں حالی کی تنقید کے موضوع پر مسلمان شعراء کی نظمیں شامل ہیں، نیز اردو ادب کا دامن تعلیم وتربیت، تزکیۂ نفس، زہد وتوکل اور صبر واستقامت کے بیش بہا سرمایہ سے بھی مالا مال ہے، اور بڑے بڑے شعراء نے ان موضوعات کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا ہے۔

اردو نثر

جذبۂ اسلامی کو پیش کرنے، مسلمانوں کے مسائل سے دلچسپی لینے اور اسلامی بیداری کی عکاسی کرنے میں اردو نثر کا حصہ شعر سے کم نہیں؛ بلکہ بڑھا ہوا ہے، کیونکہ نثر کا دامن اشعار سے زیادہ وسیع ہے، یہ علم وفن، ادب ودعوت اسلامی اور اصلاح معاشرہ سارے پہلوؤں کو محیط ہے، اردو زبان نے اپنی نشو ونما کے اس مرحلہ پر ایک طویل مسافت طے کی ہے، اور وہ وسیع رقبہ پر مشتمل ہے، اور بہت سے ایسے علمی ودینی ذخائر اپنے دامن میں سموئے ہوئے ہے جو قدیم اسلامی زبانوں کے ذخیروں کے ساتھ ہمسری کا دعوی رکھتے ہیں، بلکہ اردو میں اسلامی موضوعات پر بعض ایسی کتابیں اور مضامین موجود ہیں جن کی نظیر دوسری زبانوں میں نہیں ملتی، ان میں تاریخ وسیرت نبوی، مشاہیر اسلام وحکمائے اسلام کی سیرت اور قرآن وحدیث اور فقہ کے موضوع پر متعدد اسلامی دائرۃ المعارف اور انسائیکلوپیڈیا معرض وجود میں آچکے ہیں جو اردو والوں کو دوسری زبانوں سے مستغنی بناتے ہیں، نیز دیگر اسلامی زبانوں جیسے فارسی، عربی اور ترکی کا سارا سرمایہ اردو زبان میں منتقل کیا جاچکا ہے،

چنانچہ تحقیق وریسرچ کا کام کرنے والوں کو اس زبان میں کسی بھی موضوع پر کم مائیگی، تہی دامنی یا نقص وکمی کا احساس نہیں ہوتا، اور یہ اسلامی اثرات نثر کی تمام اقسام جیسے ناول، افسانے، حکایات، کہانیوں اور ضرب الامثال سب میں پائے جاتے ہیں۔

اردو زبان میں دعوت اسلامی، تربیت اسلامی اور اصلاح معاشرہ کے موضوع پر ایک وقیع کتب خانہ وجود میں آچکا ہے، اور ابھی تک برابر اردو زبان میں ایسے مصنفین ومؤلفین پیدا ہوتے جارہے ہیں، جو جدید نسل کی تربیت اور اس میں اسلامی شعور پیدا کرنے کا کام کررہے ہیں۔

اردو زبان وادب کی ترویج وترقی میں اور اسے آسان وعام فہم بنانے میں فکر اسلامی اور حاملین فکر اسلامی وعلم برداران دعوت اسلامی کے اثرات کا اعتراف تاریخ ادب اردو کے مؤرخ رام بابو سکسینہ نے بھی کیا ہے، ان کی کتاب کا انگریزی سے اردو میں ترجمہ مرزا حسن عسکری نے ۱۹۲۵ء میں کیا، یہ کتاب اردو ادب کی تاریخ کا ایک اہم مرجع شمار ہوتی ہے، مؤلف کتاب کہتے ہیں:

> ''مولوی اسماعیل صاحب کا مشہور رسالہ تقویۃ الایمان اور نیز دیگر مزید ان مولوی سید احمد کی تصانیف مثلاً ترغیب جہاد، ہدایۃ المؤمنین، نصیحۃ المؤمنین (اُوالمسلمین) موضح الکبائر والبدعات، مأۃ مسائل وغیرہ، ان سب سے اردو زبان کو بھی ضرور تقویت پہنچی''۔

آگے لکھتے ہیں:

> اس کے علاوہ ادب اردو کے تاریخ نگار مستشرق گارساں دتاسی کے مطابق وہ اثرات بھی سید احمد شہیدؒ کی تحریک کے حق ہی میں جائیں گے جس سے مسلمان فرقوں کی تصانیف مثلاً (۱) سید احمدیوں۔ (۲) ہندوستانی وہابیوں۔ (۳) روشنائیوں وجود میں آئیں، نیز سید احمد شہید کے دوبارہ ظہور پذیر ہونے پر رسالے لکھے گئے''۔

ان تصنیفات نے اردو نثر کی گردن سے جو تکلفات سے گراں بار تھی، تصنع، تکلف، تسجیع وابہام کا قلادہ اتار پھینکا، اور اس کی جگہ صاف گوئی، جرأت، بیباکی، سادگی وسلاست کا ہار پہنایا، جس پر سید احمد شہیدؒ کے رفقاء کی نثر نگاری کی بنیاد قائم ہے۔

اردو صحافت

اردو نثر کی ترویج وترقی میں اردو صحافت کا بھی اہم رول ہے جو ہمیشہ ذمہ دار صحافت رہی ہے، اور اس میدان میں دینی واصلاحی صحافت کا قابل ذکر کردار رہا ہے، رسالوں اور اخباروں میں لکھنے والوں کی ایک بڑی تعداد سید احمد شہیدؒ کی جماعت مجاہدین، اور دینی جذبے کے حامل علماء کی طرف منسوب رہی ہے، اور اس میدان میں دبستان سید احمد خاں اور ان کے مدرسۃ العلوم سے متعلق افراد بھی شریک ہیں، اور خاص طور پر اردو صحافت کو فروغ ہندوستان کی جنگ آزادی، خلافت عثمانیہ کے زوال اور انگریزوں کی شہ پر ہندوستان کے مختلف طبقات میں ہونے والی کشمکش اور فرقہ وارانہ فسادات کے دور میں حاصل ہوا۔

مولانا ابوالکلام آزاد

ہندوستانی صحافت میں ہمیں ۱۹۱۲ء کے ان خونریزیوں اور المیوں کی گونج سنائی دیتی ہے جب خلافت عثمانیہ یورپ کی ترک تازیوں اور چیرہ دستیوں سے دوچار تھی، اور بہت سے محکوم ممالک اس کے اقتدار سے نکل گئے، اور ان پر یورپی ممالک کا قبضہ ہوگیا، شعراء کی طرح ادباء نے بھی عالم اسلام کے ان واقعات کی تصویر کشی دل کھول کر کی، اور مغربی تہذیب پر کڑی تنقید کی، اور عالم اسلامی پر یورپی ظلم وجور کی مذمت کرتے ہوئے مغرب کی سفاکیوں اور چیرہ دستیوں سے پردہ اٹھایا، جن ادباء نے عالم عرب اور افریقہ کے اسلامی ممالک کے مسائل کو پیش کیا ان میں مولانا ابوالکلام آزاد کا نام سرفہرست ہے، جو اپنے پرجوش ادب، سیال ورواں قلم، اپنی ادبی تحریروں اور دلچسپ اسلوب کے لیے مشہور ہیں، چنانچہ وہ الہلال کے ۱۳ر جولائی ۱۹۱۲ء کے شمارہ میں لکھتے ہیں:

''مراکش میں عربی حکومت کا خاتمہ ہوگیا اور طرابلس معرض خطر میں ہے، ایسی حالت میں قدرتی طور پر افریقہ کے عہد اسلامی کا ماضی قریب یاد آجاتا ہے''۔

''طرابلس میں آج جو بازار قتال گرم ہے، الجزائر پوری ایک صدی تک اس میں مبتلا رہا جو شمالی افریقہ میں سب سے بڑی اسلامی مملکت تھی، اور جس کے لیے پہلی صدی ہجری میں عہد نبوت کا صحبت یافتہ خون بہایا گیا تھا، مسلسل خونریزیاں، پیہم عہد شکنانہ سفاکیاں، قتل عورات واطفال، احراق منازل وبلدان، ہتک مساجد واشراف اور تمام وحشیانہ اور بربری مظالم جو مسیحی غلبہ وغضب کے لازمی اجزاء ہیں، فرانس کے ہاتھوں ایک ایک کرکے الجزائر کی نصف کروڑ کی آبادی پر گذرے اور بالآخر جانبر نہ ہوسکا''۔ (الہلال، جلد اول، ۱۳ر جولائی ۱۹۱۲ء، صفحہ ۷)

عثمانی مجاہد طرابلس یوز باشی جاوید بک کے حالات بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''دنیا میں تلوار اور قلم ایک ہاتھ میں کم جمع ہوتے ہیں، تلوا کا آہنی قبضہ شاید اس قدر سخت ہے کہ اس کی گرفت کے بعد انگلیوں میں قلم کی گرفت کی صلاحیت باقی نہیں رہتی، لیکن سرزمین اسلام کے اعجوبہ زار میں کون سی شے تعجب انگیز نہیں؟ تخت حکومت اور بوریائے درویشی، گلیم فقر اور خلعت شاہنشاہی، محراب عبادت اور ایوان سلطانی، دبدبہ وسطوت اور عدل ومساوات، دولت وتجارت اور توکل وقناعت، اشتغال دنیوی اور زہد وعبادت، ترقیات مادی اور تصفیۂ روحانی، اعتماد نفس وتدبیر اور تفویض واعتقاد تقدیر، غرض کہ سینکڑوں جذبات واعمال ہمیشہ باہم مخالف چلے آتے تھے، جنہوں نے سب سے اول اس کے جامع اضداد دور خصوصیت میں ایک دوسرے سے معانقہ کیا۔ منجملہ ان کے ایک بہت بڑی خصوصیت یہ ہے کہ تیغ وقلم کی قدیمی مخالفت مٹا کر

دونوں کوایک جگہ جمع کر دیا، ممکن ہے کہ دیگر اقوام میں اس کی خال خال مثال ملے، لیکن اسلام کی تاریخ اس کی سینکڑوں مثالوں سے لبریز ہے"۔ (الہلال، جلد اول، ۱۳؍جولائی ۱۹۱۲ء، صفحہ ۱۱-۱۲)۔

ایک مقام پر ان لوگوں کا جواب دیتے ہوئے جو مسلمانوں کو یورپ یا ہندوؤں کے اتباع کی تلقین کرتے ہیں، لکھتے ہیں:

جب اتباع دین اور اعتصام بحبل اللہ المتین کی شمعیں خود ان کے یہاں فروزاں ہیں تو ان کو کسی فقیر کے جھونپڑے سے ٹمٹماتا ہوا دیا چرانے کی کیا ضرورت ہے؟

انہوں نے واضح طور پر لکھا:

"مسلمانوں کو ہر وہ پالیسی اور ہر وہ عمل جو قرآنی تعلیم پر مبنی نہ ہوگا ان کے لئے کبھی موجب فلاح وفوز نہیں ہوسکتا"۔ (الہلال، ۱۳؍اکتوبر ۱۹۱۲ء)

یہی نہیں بلکہ انہوں نے سختی کے ساتھ لکھا کہ:

"ہمارا عقیدہ ہے کہ جو مسلمان اپنے کسی عمل اور اعتقاد کے لیے بھی قرآن کے سوا کسی دوسری جماعت یا تعلیم کو اپنا رہنما بنائے وہ مسلم نہیں، بلکہ شرک فی صفات اللہ کی طرح شرک فی صفات القرآن کا مجرم بلکہ مشرک ہوگا"۔ (الہلال، ۸؍ستمبر ۱۹۱۲ء)

اگر ہم اردو زبان وادب کا جائزہ لیں تو معلوم ہوگا کہ ناول، افسانے، ڈرامے اور تاریخ میں اسلامی جذبہ اور دینی وتربیتی عناصر کا کتنا غلبہ ہے، اور ہم دیکھیں گے کہ ادباء نے ان ادبی اصناف میں بھی اسلامی مسائل اور مسلمانوں کی زندگی کی مشکلات پیش کی ہیں اور تاریخ اسلامی کی فتح مندیوں اور کامرانیوں کے ساتھ ساتھ اس کی شکستوں اور ہزیمتوں اور اسلامی تاریخ کے پر درد و پر اثر واقعات پر بھی کتابیں لکھی گئی ہیں، اسی طرح بہت سے ادباء نے اسلامی زندگی کی مشکلات اور اسلامی معاشرہ کی راہ میں حائل دشواریوں کو بھی اصلاح

کی غرض سے اپنے ناولوں اور قصوں میں جگہ دی ہے، مثلاً عبد الحلیم شرر کہ ان کا مؤثر واقعات اور داستانوں کا ایک طویل سلسلہ ہے، جن میں انہوں نے زیادہ تر مصائب ومشکلات کی تصویر کشی کی ہے، اور ان کی اس طرح کی کتابوں کو بڑی مقبولیت ملی اور شہرت دوام حاصل ہوئی۔

اردو میں تاریخ کی کتابوں نے بھی اسلامی غیرت وحمیت کو مہمیز دینے اور اخلاف کا تعلق اسلاف سے استوار کرنے میں قائدانہ کردار ادا کیا ہے جو تاریخ کا وظیفہ ہے، انگریزی سامراج چاہتا تھا کہ امت کا تعلق اس کے ماضی سے کاٹ دے اور غلط سلط تاریخ پیش کر کے نئی تعلیم یافتہ نسل کے ذہنوں میں شکوک وشبہات کا بیج بودے، لیکن آفریں ہے اردو تاریخ نویسوں پر کہ انہوں نے ماضی پر ان کا اعتماد بحال کیا اور ان کے آباء واجداد نے سیاست، علم، ادب اور فن کے میدانوں میں جو جرأت مندانہ کارنامے انجام دیئے تھے ان کی عظمت وتقدیس ان کے دلوں میں پیدا کی، ان مؤرخین کی خصوصیت یہ تھی کہ ان کا اسلامی جذبہ نیز اسلامی رنگ اور قابل عبرت وموعظت باتوں کو نمایاں کرنے کی ان کی کوشش موضوع کے ساتھ انصاف کرنے سے مانع نہیں ہوتی تھی، چنانچہ وہ لائق عبرت باتوں کی طرف توجہ بھی دلاتے تھے لیکن اس کے باوجود تاریخی پیشکش میں کوتاہی نہیں کرتے تھے، اور اپنے موضوع سے ہم آہنگ یہ تاریخ اپنے جذباتی ومؤثر اسلوب کے نتیجہ میں ایک دلآویز ادبی موضوع بن جاتی، اس کے نتیجہ میں قاری عالمی اسلوب سے قریب تر آسان تاریخی اسلوب کی پیشکش سے جذبات کی عکاسی اور قلبی ووجدانی جوش کی طرف منتقل ہوتا جو دلوں کو حیرت زدہ کر دیتا اور جو وجدانی ادب سے قریب تر ہوتا تھا۔

مولانا حکیم سید عبد الحی حسنیؒ

اس اسلوب کے بہترین نمائندے مولانا حکیم سید عبد الحی حسنیؒ اور علامہ شبلی نعمانیؒ تھے، قاری ان کی تاریخی تحریروں میں ایسے شاہکار ٹکڑے پاتا ہے جو اپنی تاثیر ودلآویزی میں کسی

فنی نثری ٹکڑے سے کم نہیں ہیں، بلکہ بعض مرتبہ وہ نثری شاعری کے ٹکڑے معلوم ہوتے ہیں، اور یہ رنگ سفرناموں، سیرت وسوانح، ملکوں کی تاریخ اور اسلامی ثقافت کی تاریخ نیز دیگر اقسام میں ظاہر ہوتا ہے۔

اسلامی جذبہ کی تاثیر ودلآویزی

اسلامی جذبہ اور اسلامی رنگ اردو زبان کا ایک شعار اور جزء لا یتجزأ بن گیا تھا، جس سے نہ کوئی تاریخی کتاب خالی ہوتی اور نہ سفرنامہ، یا ایسا کوئی مضمون جس میں اسلامی دور کے فن تعمیر یا اسلامی دور کے تاریخی آثار مثلاً حوض، تالاب، باغات، سائنسی وعلمی جائزے یا فضائی رصدگاہیں اور مناظر فطرت سے متعلق مضامین پیش کئے گئے ہوں، اور قاری ان تحریروں میں ان کی کچھ جھلکیاں پاتا ہے، اور اگر ان کا تعلق کسی المیہ، یا کسی تاریخی یادگار کے مٹنے سے ہوتا تو قاری ان کے درد وغم اور حسرت وافسوس میں ڈوبے ہوئے بیان میں اس خسارہ کی تفصیل پاتا جو اس کو پہنچا ہوتا یا عبرت کی جو باتیں ان میں ہوتیں ان سے درس عبرت لیتا۔

ہندوستان کے ایک بڑے اسلامی مؤرخ علامہ سید عبدالحی حسنیؒ جن کی کتاب ہندوستان کے مشاہیر اہل کمال کے تذکرہ میں "نزهة الخواطر وبهجة المسامع والنواظر" اور "الهند في العهد الإسلامي" (اسلامی علوم وفنون ہندوستان میں) ہے، ۱۹۴۱ء میں یعنی ہندوستان پر انگریزوں کے قبضہ کے تقریباً پچاس سال بعد دہلی، سہارنپور اور اطراف کے اسلامی آثار، علمی واسلامی مراکز اور علماء وبزرگان دین کی زیارت کو نکلے، اور اپنے سفر کے تأثرات اور یادداشتیں ان کے بے پناہ بلکہ ٹھاٹھیں مارتے ہوئے اسلامی جذبہ کی عکاسی کرتی ہیں، اور ان کے بعض مقامات قاری کو خون کے آنسو رونے پر مجبور کردیتے ہیں، جب وہ اپنے دردمند قلم اور زخمی دل سے اسلامی آثار کی کہنگی وبے بسی اور ان کی خستہ حالی کا تذکرہ کرتے ہیں، اور یہ بتاتے ہیں کہ سیاسی انقلاب نے ان میں کیا تبدیلیاں کیں اور ان کو کیا سے کیا بنادیا، لیکن اب بھی وہ شاندار دور کی یاد دلاتے ہیں۔

لال قلعہ کی سیر کے وقت ان کا یہ جذبہ چھلک پڑتا ہے اور وہ کہتے ہیں:

''ہم مسجد سے براہ راست قلعہ گئے، یہ قلعہ بالکل سنگ سرخ کا بنا ہوا ہے، اپنی لطافت اور سبکی میں بے نظیر ہے، دروازہ پر ایک گورا ٹہل رہا تھا، اس نے ٹکٹ لے لیا، اور ہم اندر روانہ ہوئے، قلعہ کے اندر جانے کے بعد متعدد دروازے اور ڈیوڑھیاں مسلسل ملتی ہیں، ان میں اب آج کل گورا بازار ہے، اس سے نکل کر پھر بالکل ویران اور غیر آباد ہے، کہیں کہیں انگریزی عمارتیں اور بارکیں بنی ہوئی ہیں، شاہی عمارتیں بالکل متاصل کردی گئی ہیں، ان کے نشانات اب صرف دربار عام کے ایک درجہ سے اور دربار خاص وحمام ومسجد ومثمن برج سے معلوم ہوتے ہیں، جن کے دیکھنے سے ایسی عبرت ورقت ہوتی ہے جو کسی طرح بیان میں نہیں آسکتی۔ سبحان اللہ! یہ وہ مکانات ہیں جن میں ہر کس وناکس کے پہنچنے کی مجال نہ تھی، بڑے بڑے امراء ہفت ہزاری وپنج ہزاری دربار عام تک پہنچنے کو فخر وسعادت سمجھتے تھے، وہی تخت جس کے سامنے درباری اکبری وجہانگیری میں سجدہ کرتے تھے، اور درباری شاہجہانی وعالم گیری میں اس کے پائے کو بوسہ دینے کو فخر سمجھتے تھے، آج ادنی ادنی گورا جوتہ پہنے ہوئے اسی کو روندتا ہے۔ فاعتبروا یا أولي الأبصار۔ الملک للّٰہ، والأمر للّٰہ، والأرض للّٰہ، یورثھا من یشاء۔

مجھ کو معاف کیجئے گا، ان مکانوں کے دیکھنے سے میرا دل ایسا بے قابو ہے کہ میں ان کے حالات بیان کرنے سے بھی قاصر ہوں، بلکہ جو شخص ان درباروں کی ہسٹری اور قلعہ کی جاگرفی سے ماہر ہے وہ کیا ممکن ہے کہ ان کو دیکھ کر آٹھ آٹھ آنسو نہ روئے، اس کا دل بے چین نہ ہوجائے، اس کے بدن پر رونگٹے نہ کھڑے ہوجاویں، اس کی آنکھوں کے سامنے خدا کی سچی عظمت وہیبت نمودار نہ ہوجائے، دنیا کے فانی ہونے کا پردہ نہ اٹھ جائے، ذرا تھوڑی

دیر کے واسطے آپ حدیقۃ الاقالیم میں محمد شاہی دربار کا سماں دیکھ لیجئے، پھر عالم شاہی دربار کا تنزل ملاحظہ فرمایئے، پھر ان ٹوٹی پھوٹی دیواروں میں کرّ وفر شاہی کے آثار دیکھئے۔ اللّٰہ اللّٰہ، ولا موجود إلا اللّٰہ۔

اب نہ وہ زمانہ ہے، نہ وہ لوگ ہیں، نہ بادشاہ ہیں، نہ ان کے درباری، یہ ٹوٹی پھوٹی عمارتیں باقی ہیں، جو زبان حال سے مسلمانوں کے اقبال وادبار، ترقی وتنزلی کو بیان کررہی ہیں، بڑا سنگ دل ہے وہ شخص جو ان کو دیکھ کر نہ رو اٹھے، بڑا قاسی القلب ہے وہ مرد جو ان کو دیکھ کر متأثر نہ ہو، بڑا بے حمیت ہے وہ مسلمان جو مسلمانوں کے اقبال وادبار کی ان حقیقی تصویروں کو دیکھ کر خاموش رہے، بڑا بے غیرت ہے وہ نیچری جو کارخانۂ قدرت کی ان نیرنگیوں کو دیکھ کر اپنے عقیدہ پر نادم نہ ہو۔

کیا یہ وہی دربار خاص ہے جن میں بڑے بڑے سلاطین ہند علی قدر مراتب کھڑے ہونے کو فخر سمجھتے تھے، کیا یہ وہی تخت ہے جس کے سامنے بڑے بڑے مہاراجہ سر جھکانے کو اپنا دین وایمان جانتے تھے، یہ سب کارخانۂ قدرت کی نیرنگیاں ہیں، فانی ہے اور زائل تمام کائنات۔ اور باقی ہے وہ ذات جس کے قبضۂ قدرت میں تمام عالم کی موت وحیات ہے، جس کی قدرت اور بقاء پر عالم کے نشیب وفراز، گرم وسرد، تلخ وشیریں، تغیرات وحوادث بآواز بلند گواہی دے رہے ہیں، کل شيء ھالک إلا وجھہ"۔

مؤرخ کا قلم رکتا نہیں؛ بلکہ وہ ان آثار کی مزید تصویر کشی کرتا جارہا ہے اور اپنے رنج وغم کا اظہار پر درد اسلوب میں کررہا ہے، ادھر قاری کا حال یہ ہے کہ وہ جملہ پر رکتا ہے، آہ سرد کھینچتا ہے اور جب اس کے غم کو ذرا سکون ملتا ہے تو آگے بڑھتا ہے۔

یہ صرف ایک نمونہ ہے، اسی طرح سلاطین گجرات اور وہاں کی تاریخ بیان کرتے وقت ان کا غم تازہ ہوجاتا ہے اور وہ ان فنی یادگاروں کو پیش کرتے ہیں جو مسلمانوں نے دنیا

کے مختلف خطوں میں چھوڑی ہیں، تاریخ نگاران سے خود بھی متاثر ہوتا ہے اور دوسروں کو بھی متاثر کرتا ہے، اور دلوں میں اسلام اور تاریخ اسلام پر فخر اور عظمت اسلامی کے ان مٹے ہوئے نقوش وآثار سے عبرت پذیری کا ایک طوفان بلاخیز اٹھتا ہے۔

یہ بعض نمونے اور مثالیں ہیں جو اردو زبان وادب اور شاعری میں اسلامی عنصر کی اثر انگیزی ودلآویزی کو پیش کرتی ہیں، اور یہ مثالیں اتنی زیادہ ہیں کہ ان کو تلاش کرنے والا کتابوں سے ان کو ڈھونڈھ نکالنے میں کوئی دشواری محسوس نہیں کرے گا، یہ مثالیں نثر بدیع میں، ناول میں، افسانے اور تاریخ وسیرت میں، اور سفرناموں سب میں پائی جاتی ہیں۔ اور یہ بزرگوں کے مواعظ وملفوظات اور حکایتوں اور اشعار میں زیادہ مؤثر انداز میں ملتی ہیں، اس طرح اردو زبان نے کسی دوسری زبان کے مقابلہ میں اسلامی عنصر سے زیادہ اثر قبول کیا ہے، اور اس میں انحراف اور بگاڑ کم سے کم آیا ہے، اور تاریخ کا کوئی بھی دور اس رنگ سے خالی نہیں رہا ہے، حتی کہ جدید دور میں بھی جب کہ مادہ پرستانہ مغربی تہذیب دنیا کی ہر زبان حتی کہ عربی زبان پر بھی اپنے شکنجے مضبوط کر چکی ہے، یہ رنگ موجود ہے۔

اردو ادب میں قصہ نگاری

اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ قصہ ادب میں اہم صنف ہے اور وہ بعض وقت شعر سے زیادہ تأثیر رکھتا ہے، شعر کا اثر وقتی ہوتا ہے، لیکن قصہ پوری زندگی پر اثر انداز ہوتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی حقیقت ہے کہ قصہ کا دور اور اس کا عمل شعر کے دور اور اس کے عمل سے پہلے شروع ہو جاتا ہے، اس کی ابتداء ماں کی گود سے ہوتی ہے، مائیں اپنے ذوق اور مزاج کے اعتبار سے قصوں کے ذریعہ بچوں کا دل بہلاتی ہیں، اور بعض وقت بعض قصے بچے کی ذہن کی تشکیل میں اہم رول ادا کرتے ہیں، بعض بڑی شخصیتوں کے تذکرہ میں ایسے قصوں کا تذکرہ ملتا ہے، جو انہوں نے بچپن میں سنے یا پڑھے، اور بعض قصے نفسیات اور فکر پر اثر انداز ہوتے ہیں۔

قصہ کی اہمیت اور تأثیر کے پیش نظر مصلحین اور معلمین ذہن سازی کے لئے اور تأثیر قلبی کے لئے قصوں کا سہارا لیتے ہیں، قرآن کریم میں اور حدیث شریف میں بھی قصوں کا عظیم سرمایہ ہے۔ قرآن کریم میں کئی جگہوں پر قصہ کی اہمیت بیان کی گئی ہے ﴿فاقصص القصص لعلهم يتفكرون﴾ [اعراف:۱۷۶] ﴿نحن نقص عليك أحسن القصص﴾ [یوسف:۳]۔

قصہ کسی شکل میں ہو، ہر دور میں رہا ہے، قصوں سے انسان کا ربط نیا نہیں، انسان کی اس سے دلچسپی ازلی ہے، یہی وجہ ہے کہ اس فن کا آغاز مصوری، بت تراشی اور دیگر فنو لطیفہ سے پہلے ہوا۔

عبدالقادر سروری ''دنیائے افسانہ'' میں لکھتے ہیں:۔

''یہ دنیا کا سب سے قدیم فن ہے، جس زمانہ میں مصوری، بت تراشی اور دیگر فنون لطیفہ مستور بلکہ خیال میں بھی دور تھے، افسانہ دنیا سے روشناس ہو چکا تھا، اور اپنے منتہائے پیدائشی کو بوجوہ احسن پورا کر رہا تھا، یونانی نقطۂ نظر سے یہ فن شاعری

اور موسیقی سے بھی زیادہ قدیم ہے، اس کی جہانگیری کا یہ حال ہے کہ کائنات کے کسی گوشے میں ایسی قوم کا پتہ نہیں چلتا جس کے کان قصوں سے نا آشنا ہوں"۔

عربی ادب میں اختصار اور ادبی خصوصیت کی وجہ سے اس کے لئے نوادر کا لفظ استعمال ہوا ہے اور متعدد مصنفین نے نوادر جمع کیے ہیں، "قالی" کی "الامالی" کے آخر میں "کتاب النوادر" کو بعض لوگوں نے ادب عربی کا لب لباب قرار دیا ہے، اور اس طرح کی متعدد کتب نوادر ہیں، عصر جاہلی میں عربوں کی مجالس ہوتی تھیں اور ان میں فروسیت، شجاعت، سخاوت اور مروت سے متعلق قصے سنائے جاتے تھے۔ بعض میں بہت معروف یا نا قابل یقین واقعات بھی ہوتے، المبرد نے اپنی کتاب "الکامل" میں "اکاذیب الاعراب" ایک عنوان قایم کیا ہے، جس میں بعض نا قابل یقین واقعات بیان کیے ہیں۔

حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے عہد میں قصوں سے دلچسپی کے تذکرہ ملتے ہیں، عباسی عہد میں ایک طبقہ قصاصین کا وجود میں آ گیا تھا۔

ان مختصر قصوں کے علاوہ طویل قصوں کا تذکرہ بھی ملتا ہے، فروسیت کے سلسلہ میں عنترہ، سخاوت میں حاتم طائی، فتح ونصرت میں سیف بن ذی یزن اور آخر دور میں عیاری وشطاری میں مقامات اور پھر الف لیلۃ ولیلۃ کا عربی ادب میں تذکرہ ملتا ہے۔ مغربی ادب سے واقفیت اور استفادہ کے بعد انیسوی صدی سے عربی ادب میں قصہ نگاری نے نیا انداز بیان اختیار کیا، اور اخبار ورسائل سے اس صنف کو وسعت اور مقبولیت حاصل ہوئی۔ ان قصہ نگاروں نے سماج کو موضوع بنایا اور سماجی تبدیلی میں ان کا اہم حصہ ہے۔ لطفی منفلوطی، ڈاکٹر طہ حسین، محمد حسین ہیکل، جبران خلیل جبران، محمد تیمور اور نجیب محفوظ سے ہندوستان کے لوگ واقف ہیں اور ان میں سے اکثر کے قصے اردو میں ترجمہ کئے گئے اور مقبول ہوئے۔ نجیب محفوظ کو ان کی قصہ نگاری پر نوبل پرائز بھی دیا گیا۔

قدیم عہد میں قصوں کا مقصد تفریح طبع اور مسرت کا حصول تھا، عصر حاضر میں مغربی ادب کا اثر جس طرح زندگی کے مختلف شعبوں پر پڑا، ادب پر بھی پڑا اور اس سے قصہ چاہے وہ مختصر قصہ ہو یا ناول، یا ڈرامہ، متاثر ہوا، اور اس کو ذہن سازی کا ذریعہ بنایا گیا۔

اردو ادب میں داستانوں اور ناولوں کے بعد افسانہ یا مختصر قصوں کا انیسویں صدی سے آغاز ہوا، جس میں تفریح کے ساتھ مقصدیت شامل ہوگئی جو تعلیم و تربیت میں اہم عامل قرار پائی، ڈپٹی نذیر احمد، سرشار، شرر اور مرزا ہادی رسوا، یا منشی پریم چند، یا بعد کے افسانہ اور ناول نگار سجاد حیدر یلدرم، نیاز فتحپوری، آل احمد، قرۃ العین حیدر، اور قدرت اللہ شہاب انہوں نے سماج اور زندگی کے مسائل کو موضوع بنایا۔ اس طرح قصہ کے ذریعہ ذہن سازی کا کام لیا جانے لگا۔ قصہ نگار نے سماج کو یا انفرادی زندگی کو اپنے تصور کے مطابق پیش کرنا شروع کیا، ان میں ایسے اہل قلم بھی تھے جو واقعہ نگار تھے، مگر ان کا مقصد سماج کی تصویر پیش کرنا تھا، کچھ ایسے بھی اہل قلم تھے جو بہتر زندگی کی ترغیب اور تلقین کے لئے قصہ کو ذریعہ بنانا چاہتے تھے، کچھ لوگوں نے تاریخ کو موضوع بنایا، اس لئے کہ تاریخ سے بھی قومیں سبق لیتی ہیں، اور اپنے حال اور مستقبل کی تشکیل میں مدد لیتی ہیں۔

اردو ادب میں قصہ نگاروں کو مختلف طبقات میں تقسیم کیا جا سکتا ہے، جن میں مصلحین بھی ہیں اور واقعہ نگار بھی، اور مغربی افکار و نظریات اور رجحانات کے داعی بھی، کمیونزم کے دور میں ترقی پسند ادیبوں نے سماج کی قدروں اور نظام کے بارے میں نئے تصورات پیش کئے، بعض کی تحریروں میں دین اور خاص طور پر اسلام کو نشانہ بنایا گیا، بعض قصہ نگاروں نے اخلاقی قدروں کو نظر انداز کر کے مغرب کے مادی تصور حیات کو پیش کیا۔

اس دور میں اسلام پسند ادیبوں نے اخلاق اور عقائد کے احترام کو باقی رکھنے اور ان کی ترغیب کے لئے قصہ کو ذریعہ بنایا۔ قدیم تاریخ کا مغرب کے اہل قلم نے جس طرح مذاق اڑایا اور اس میں تحریف اور تزویر سے کام لیا ان قصہ نگاروں نے قدیم اسلامی تاریخ اور تاریخ کی اہم شخصیتوں اور حکمرانوں کو عزت کا مقام عطا کرنے کے لئے اور نئی نسل کو شرمندہ ہونے سے بچانے کے لئے قصوں اور ناولوں کا سہارا لیا۔

علماء گجرات

اوران کی ادبی وعلمی خصوصیات

علم وفن اورزبان وادب میں زمان ومکان کو بڑی اہمیت حاصل ہے، خصوصاً ادبی تخلیقات میں مکان کی بڑی اہمیت ہے، اساطین فن اور ناقدین کا خیال کا ہے کہ جس طرح کلام کے حسن و جمال میں الفاظ کے انتخاب کا اثر پڑتا ہے، ٹھیک اسی طرح ادبی تخلیقات کی اثر آفرینی، جدت ولطافت اور حلاوت میں زمان ومکان کا اہم رول ہوتا ہے، یہی وجہ ہے کہ عالمی رابطہ ادب اسلامی جگہ کے انتخاب کو بڑی اہمیت دیتا ہے۔

سیمیناروں کے لئے ان جگہوں کا انتخاب کیا گیا جو قدرتی اور جغرافیائی اہمیت، اور علمی وادبی پس منظر رکھتی ہیں، جس سے رابطہ کے علمی مذاکرے بڑے کامیاب رہے، اور علمی وادبی حلقوں میں اس کی پذیرائی ہوئی، ایک علمی مذاکرہ مہاراشٹر کے عظیم تاریخی شہر اورنگ آباد میں منعقد ہوا جس کو مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ نے ''غرناطہ ہند'' قرار دیا ہے۔ اورنگ آباد تاریخی اہمیت کا حامل شہر ہے، یہ ملک عنبر کا پائے تخت تھا، اور مغل شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی عمر کے آخری ۲۵ سال یہیں گزارے، ملک عنبر کی بنائی ہوئی جامع مسجد میں فتاوی عالمگیر کی ترتیب اور تدوین شروع ہوئی اور اورنگ زیب کو ان کی وصیت کے مطابق خلد آباد میں متعدد اہل اللہ اور اولیائے کرام کی قبروں کے بیچ دفن کیا گیا۔ اس علاقہ میں بڑے بڑے ادبا، شعرا اور ماہرین فن علماء پیدا ہوئے، اسی کے ساتھ ساتھ یہ علاقہ قدرتی حسن و جمال میں اپنی مثال آپ ہے، یہاں ایسے تاریخی آثار ومقامات بھی بکثرت ہیں، جن کے حسن وزیبائش سے طبیعت کو جلا اور قلب

وجگر کو بالیدگی حاصل ہوتی ہے، اور سیمینار کا موضوع ''کتب سیرت کا ادبی جائزہ'' بھی علمی، ادبی اور تاریخی حیثیت سے اہمیت کا حامل تھا کیونکہ اس کا تعلق ذات نبویؐ سے تھا۔

گجرات کی تاریخی اور جغرافیائی حیثیت

اورنگ آباد کی طرح گجرات بھی تاریخی اور جغرافیائی اعتبار سے ممتاز حیثیت رکھتا ہے، علوم وفنون کی خدمت کے تعلق سے گجرات کا نمایاں کردار رہا ہے، مغل بادشاہ شاہجہاں کی نظر میں اگر چہ ''جونپور'' ''شیراز ہند'' تھا، تو اورنگ زیب عالمگیر گجرات کو ہندوستان کی حسن وزیبائش سمجھتے تھے، ابوالفضل کے بقول اس کی حیثیت ایک گلستان کی تھی، جس میں ہر رنگ وبو کے پھول مہکتے تھے، گجرات صدیوں تک علم وفن کا مرکز، ارباب ہنر کا گہوارہ ارشاد وتلقین کا سرچشمہ، اقتصادی زندگی کی شہ رگ اور ایک سرگرم تجارتی منڈی رہا ہے، اور روحانی اور مادی زندگی کی ساری نعمتیں یہاں جمع ہوگئی تھیں، گجرات کو یہ امتیاز بھی حاصل ہے کہ سب سے پہلے عرب اسی سرزمین پر پہونچے، ، ہندوستان کا یہی وہ علاقہ تھا جس کے سرسبز پہاڑوں پر مسلمانوں کی سب سے پہلے نگاہ پڑی تھی، ارض ہند سے عربوں کے تعلق کی ابتداء حقیقتاً اسی خطۂ سرزمین سے ہوئی، مشہور مؤرخ علامہ عبدالحی حسنی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ:۔

> ''مشہور ہے کہ سب سے پہلے اسلامی تعلقات ہندوستان میں سندھ کے ساتھ وابستہ ہوئے، اور ۹۳ھ میں محمد بن قاسم ثقفی نے ریگستان سندھ کو طے کر کے جو عرب کے ساتھ خصائص مرز بوم کے لحاظ سے بہت سی باتوں میں مشابہت رکھتا ہے، ہندوستان میں اسلامی سلطنت قائم کی، جس کے حدود ایک طرف راجپوتانہ سے ملتے تھے اور دوسری جانب وادیٔ کشمیر سے، اور یہ سلطنت کم وبیش بارہ سو برس تک مسلمانوں کے زیر حکومت واقتدار رہتی آئی، مگر اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ سب سے پہلے مسلمانوں کی نگاہ دور بیں گجرات کے سرسبز پہاڑوں پر پڑی تھی، اور ان کا یہ مطمح نظر اس وقت تک قائم رہا جب تک کہ وہ گجرات پر قابض ومتصرف نہیں ہوگئے''۔ (یادایام، ص:۴۳-۴۴)

سرزمین گجرات کا امتیاز

مؤرخین کا خیال ہے کہ اسلام کی آمد سے بہت پہلے سے ہندوستان کے عربوں کے ساتھ تجارتی روابط قائم تھے، ۱۵ھ میں فاروق اعظم حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے بحرین وعمان کی حکومت پر عثمان بن ابی العاص ثقفیؓ کو نامزد فرمایا، جن کا شمار صحابہ کرام میں تھا، انہوں نے عنان حکومت ہاتھ میں لینے کے ساتھ حکم بن ابی العاصؓ کو بحرین کی حکومت پر نامزد کر کے حکم دیا کہ وہ ہندوستان پر فوج کشی کریں، حکم نے کشتیوں کے ذریعہ سے دریائی سفر کی سخت منزلیں طے کیں، اور اپنی فوج کو لئے ہوئے سب سے پہلے سواحل گجرات پر قدم رکھا، یا یوں کہنا چاہئے کہ ہندوستان کی سرزمین میں سب سے پہلے گجرات کو یہ شرف حاصل ہوا اور اس سرزمین کے دشت وجبل ہندوستان میں سب سے پہلے اللہ اکبر کے نعروں سے گونجے۔

اس کے بعد دوسرا حملہ حکم بن ابی العاص نے بھروچ (BHRUCH) پر کیا جس کو عربی کتابوں میں ''بروج'' یا ''بروص'' کے ناموں سے یاد کیا جاتا ہے، اور جو اس زمانہ میں نیل اور لاکھ کی تجارت کی وجہ سے ہندوستان کا سب سے پررونق اور آباد بندرگاہ تھی، ابن الاثیر اور علامہ بلاذری نے بھی اسی طرف اشارہ کیا ہے۔

اس کے بعد یہ علاقہ عربوں کی توجہ کا مرکز بن گیا، ۱۵۹ھ میں عباسی خلیفہ المہدی باللہ نے عبدالملک بن شہاب المسمعی کی سرکردگی میں گجرات کے علاقہ میں جو فوج بھیجی تھی، اس میں ابوبکر ربیع بن صبیح البصری بھی شامل تھے، وہ نہ صرف تابعی تھے، بلکہ حدیث کی پہلی کتاب انہوں نے ہی تیار کی تھی، صاحب کشف الظنون حاجی خلیفہ رقم طراز ہیں: ''ھو أول من صنف في الإسلام'' ان کے حلقۂ تلامذہ میں امام سفیان ثوری، امام عبدالرحمٰن بن مہدی، امام وکیع بن جراح، امام علی بن عاصم، جیسے ائمۂ مجتہدین شامل تھے، اسی طرح گجرات میں علم حدیث کی داغ بیل ایسی مبارک ہستی کے ہاتھوں پڑی، جس کے خرمن کمال کے خوشہ چیں اس عہد کے مشاہیر ارباب فضل وکمال تھے، دہلی کا مرکز حدیث، گجرات کے بہت بعد منصۂ شہود پر آیا، شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے ابھی مسند درس نہیں

بچھائی تھی کہ گجرات علم حدیث کا مرکز بن چکا تھا، صحیح بخاری کی دو شرحیں جو غالباً ہندوستان میں بخاری کی سب سے قدیم شرحیں ہیں، یعنی بدرالدین محمد بن ابی بکر کی ''مصباح الجامع فی شرح صحیح البخاری'' اور سید عبدالاول بن علاء الحسینی کی ''فیض الباری فی شرح صحیح البخاری'' اسی سرزمین پر لکھی گئی تھیں، علامہ عبدالحی حسنی لکھتے ہیں:۔

> بعض علماء نے شیخ عبدالحق محدث دہلوی کی نسبت لکھ دیا ہے ''اول او در ہندوستان حدیث آورد ونشر کرد'' اگر دہلی کے لحاظ سے یہ کہا جائے تو ایک حد تک صحیح ہے، لیکن اگر گجرات کو بھی آپ ہندوستان کا ایک صوبہ تسلیم کرتے ہیں، تو غلط اور قطعاً غلط ہے، شیخ عبدالحق کی جلالت قدر میں کچھ شبہ نہیں، انہوں نے حدیث شریف کی بڑی خدمت کی ہے، برسوں درس دیا، کتابوں کے ترجمے کئے، اور اس فن شریف کو جو کبریت احمر اور عنقائے مغرب ہو رہا تھا، ہر کہ ومہ تک پہنچایا، لیکن اس واقعہ سے بھی انکار نہیں کہ حضرت شیخ ہنوز عالم وجود میں بھی نہ آئے تھے، اس وقت گجرات میں شیخ الاسلام زکریا، شمس الدین سخاوی اور علامہ ابن حجر مکی کے تلامذہ کی درسگاہیں کھلی ہوئی تھیں، اور تشنگان حدیث ان سے سیراب ہو رہے تھے۔ (یادایام، ص:۷۰)

گجرات کے ممتاز علماء

گجرات میں شیراز ویمن اور دیگر ممالک اسلامیہ کے چیدہ وبرگزیدہ علماء نے بود وباش اختیار کی، جن کے فیوض سے چند دنوں میں گجرات مالا مال ہوگیا، اور خود گجرات میں اس پائے کے علماء پیدا ہوئے جن کے فیوض علمی کی آبیاری سے اب تک ہندوستان کی درس گاہیں سیراب ہو رہی ہیں، یہاں جلیل القدر علماء اور مستند اور باکمال ماہرین فن پیدا ہوئے جنہوں نے تمام علوم وفنون کے فروغ واشاعت میں عظیم الشان خدمات انجام دیں، بقول علامہ عبدالحئ حسنی: ''گجرات اگر علوم عقلیہ کے اعتبار سے شیراز تھا، تو حدیث شریف کی خدمت کے لحاظ سے یمن میمون سے مماثلت رکھتا تھا''، گجرات زمانہ سابق میں علوم وفنون کا مرجع ومقصد بنا ہوا تھا، اور تھوڑی سی مدت میں ایسے ارباب فضل وکمال وہاں سے نکلے جن کی فہرست بڑی طویل ہے، مثال کے طور پر چند کا تذکرہ مناسب معلوم ہوتا ہے:۔

جمال الدین محمد بن عمر حضرمی متوفی ۹۳۰ھ، علامہ وجیہ الدین محمد بن محمد مالکی جو علامہ شمس الدین سخاوی کے شاگرد رشید تھے، اور شاہان گجرات نے ان کو ملک المحدثین کا خطاب دیا تھا، ساری عمر گجرات میں رہے، اور ۹۲۹ھ میں وفات پائی، شیخ مرتضی بلگرامی صاحب تاج العروس شرح القاموس، جنہوں نے سورت میں ایک سال گزارا اور یہیں کے علماء سے علم حدیث حاصل کیا۔ شیخ عبد المعطی بن الحسن باکثیر مکی متوفی ۹۸۳ھ، شہاب الدین احمد العباسی متوفی ۹۹۲ھ، شیخ سعید شافعی حبشی متوفی ۹۹۱ھ، وغیرہم۔

علماء گجرات میں شیخ احمد کہتو، مفتی رکن الدین بن حسام الدین ناگوری، مولانا راج بن داود، قاضی جگّن، مولانا علاء الدین، احمد نہروالی، مولانا عبد الملک عباسی، مولانا قطب الدین، شیخ ابو صالح حسن بن محمد، قاضی برہان الدین، قاضی علاء الدین عیسی، مولانا صبغت اللہ بن روح اللہ الحسینی، عبد اللہ محمد بن عمر آصفی الف خانی، مولانا احمد بن سلیمان کردی، مولانا محمد فرید، سید محمد بن جعفر بن جلال بن محمد حسینی، شیخ جمال الدین، مولانا ولی اللہ سورتی، مولانا نور الدین بن محمد صالح احمد آبادی، مولانا خیر الدین محمد زاہد سورتی، مولانا عبد الرزاق سورتی، قابل ذکر ہیں۔

تنہا دیبل میں بکثرت ایسے علماء پیدا ہوئے جنہوں نے براہ راست چوتھی صدی کے محدثین عظام سے استفادہ کیا، ان میں مشہور ترین مندرجہ ذیل ہیں:۔

ابو جعفر متوفی ۳۴۶ھ، ابراہیم بن محمد متوفی ۳۴۵ھ، احمد بن عبد اللہ متوفی ۳۴۳ھ، محمد بن محمد بن عبد اللہ متوفی ۳۴۶ھ، حسن بن محمد بن اسد متوفی ۳۵۰ھ، خلف بن محمد متوفی ۳۶۰ھ، احمد بن محمد بن ہارون متوفی ۲۷۵ھ، حسن بن حامد متوفی ۴۰۷ھ، شیخ محمد بن عبد اللہ فاکہی حنبلي تلمیذ ابن حجر مکي متوفی ۹۹۲ھ، شیخ سید بن عبد اللہ عیدروس تلمیذ ابن حجر مکي، عبد الرحمٰن بن ربیع شیبانی متوفی ۹۹۰ھ، شیخ سعید شافعی تلمیذ ابن حجر مکي متوفی ۹۸۴ھ، جمال الدیں متوفی ۹۳۹ھ، وجیہ الدین متوفی ۹۲۹ھ۔

گجراتی امراء کی علم پروری

ابو القاسم عبد العزیز گجراتی (م ۹۶۱ھ) جو آصف خاں وزیر گجرات کے لقب سے

مشہور تھے، فاضل و باکمال وزراء کی صف میں شامل ہیں، علامہ حجاز شہاب الدین ابن حجر مکی نے ان کے حالات ومناقب میں ایک مستقل رسالہ لکھا ہے، اس میں ان کے فضل وکمال اور تقوی وتقدس کی بڑی مدح سرائی کی ہے، وہ لکھتے ہیں: ''کہ جس زمانہ میں آصف خاں مکہ معظمہ میں آکر رہے تھے، تو عجب طرح کی رونق مکہ معظمہ میں پیدا ہوگئی تھی، علماء اور فقہاء ان کی صحبت کو غنیمت سمجھتے تھے اور گھر گھر علم کا چرچا ہوگیا تھا''۔

شعراء حجاز نے آصف خاں کی تعریف میں قصیدے لکھے ہیں اور اس کی وفات کے بعد نہایت پراثر اور غم انگیز مرثیہ لکھا ہے۔

شیخ علاء الدین علی مہائمیؒ

شیخ علاء الدین علی بن احمد مہائمی گجرات کے سرمایہ ناز ہیں، ہندوستان میں شاہ ولی اللہ دہلوی کے سوا حقائق نگاری میں ان کا کوئی نظیر نہیں، انہوں نے قرآن کریم کی ایک تفسیر ''تبصیر الرحمٰن وتیسیر المنان في تفسیر القرآن'' لکھی ہے جو دو ضخیم جلدوں میں ہے، علامہ عبدالحی حسنی رقم طراز ہیں ہے کہ: ''تفسیریں تو سیکڑوں لکھی جا چکی ہیں، مگر جس بات سے ان کی تفسیر کو امتیاز اور خصوصیت حاصل ہے، وہ یہ ہے کہ اس میں التزام کے ساتھ تمام قرآن پاک کی آیات کریمہ کے باہم دگر مربوط ہونے کو ایسے دل نشیں طریقہ سے بیان کیا ہے جس کو پڑھ کر انسان وجد میں آجاتا ہے، اور بے ساختہ منہ سے داد نکلتی ہے''۔ ان کی دوسری کتاب ''انعام الملک العلام باحکام حکم الاحکام'' اسرار شریعت کے علم میں ہے، بقول علامہ عبدالحی حسنی: ''اس فن میں سب سے پہلی تصنیف ہے، شاہ ولی اللہ دہلوی نے اپنی اسی فن میں ''حجۃ اللہ البالغۃ'' نام سے ایک کتاب لکھی ہے، جس میں دعوی کیا ہے کہ اب تک اس فن میں کوئی مستقل کتاب نہیں لکھی گئی، یہ اس بات کی دلیل ہے کہ سب سے اول مہائمی نے اس فن میں کتاب لکھی ہے، جو شاہ ولی اللہ دہلوی کی نظر سے نہیں گزری''۔ اس کے علاوہ مہائمی کی اور بھی تصنیفات ہیں، جو علم وفن کا شاہکار ہیں۔

علامہ محمد طاہر پٹنیؒ

علامہ محمد طاہر پٹنی، بلند پایہ محدث تھے جن کے فضل وکمال کی شہرت پورے عالم میں

ہے، علامہ طاہر پٹنی کی تصنیفات سے حجاز و یمن کے علماء اسی طرح فائدہ اٹھاتے ہیں جیسا کہ ہندوستان کے علماء، علامہ طاہر پٹنی نے مکہ مکرمہ جا کر شیخ ابوالحسن بکری، علامہ ابن حجر مکی، شیخ علی بن العراق، شیخ جار اللہ بن فہد و دیگر محدثین عظام سے حدیث شریف پڑھی، اور عرصہ تک شیخ متقی کی صحبت میں رہے، شیخ عبدالقادر حضرمی ''النور السافر'' میں لکھتے ہیں:۔

''علامہ طاہر پٹنی زہد و ورع، خشیت و انابت، تقوی اور علم و فن کے اعلی درجہ پر فائز تھے، دقت نظر، وسعت مطالعہ اور تبحر علمی میں بے نظیر تھے، مختلف علوم وفنون میں انہیں مہارت حاصل تھی، ہمارے بعض مشائخ نے فرمایا ہے کہ یہ بھی معلوم نہیں ہے کہ علماء گجرات میں فن حدیث کے اندر کوئی ان سے لگا کھاتا ہو''۔

علامہ پٹنی کی عظیم الشان تصنیفات میں سب سے مشہور تصنیف لغت حدیث میں ''مجمع بحار الانوار فی غرائب التنزیل ولطائف الاخبار'' ہے، جس کو یہ کہنا چاہیے کہ صحاح ستہ کی شرح ہے، نواب صدیق حسن خاں قنوجی نے اتحاف النبلاء میں لکھا ہے: ''جب سے یہ کتاب تصنیف ہوئی ہے اسی وقت سے اہل علم میں مقبول ہے، اور سب کو اس پر اتفاق ہے، علامہ محمد طاہر پٹنی نے اس کو تصنیف کر کے علماء پر بہت بڑا احسان کیا ہے''۔ اس کتاب کے علاوہ ان کی اور معرکہ آراء کتابیں ''المغنی فی اسماء الرجال'' اور ''تذکرۃ الموضوعات'' وغیرہ ہیں، ۹۸۶ھ میں وفات ہوئی۔

اخیر عہد میں علامہ عبدالعزیز میمن راجکوٹی کی شخصیت ہے جو عالم عربی میں قدر کی نگاہوں سے دیکھی جاتی ہے، علامہ محقق کی تصنیفات بحث و تحقیق کے اعلی معیار پر فائز ہیں، ان کی مشہور کتاب ''ابوالعلاء المعری و مالیہ'' ہے جو بحث و تحقیق کی کسوٹی پر کھری اترتی ہے، ایک دوسری کتاب ''سمط اللآلی فی شرح الامالی للقالی'' ہے، جس میں ابوعبید بکری کا بھرپور مؤاخذہ ہے، علامہ میمنی نے اپنی کتابوں میں مستشرقین کے گمراہ کن افکار و خیالات اور تحقیقات کا بھرپور جواب ہی نہیں دیا؛ بلکہ ان کی قلعی کھول دی ہے، خاص طور سے مارگیولوتھ اور ان کے خوشہ چیں ڈاکٹر طہ حسین کے گمراہ کن خیالات کا ازالہ کیا جنہوں نے پورے عالم عربی کو اپنی جادو بیانی اور نئی تحقیقات سے مسحور کر دیا تھا۔

اردو زبان وادب کے ارتقاء میں دکن کا حصہ

اردو زبان دنیا کی دیگر زبانوں سے بہت سے امور میں مختلف ہے؛ جن میں پہلا اور بنیادی اختلاف یہ ہے کہ اردو زبان ایک جدید زبان ہے جس کی عمر تین سو سال سے زیادہ نہیں، یہ مغلوں کے آخری دور میں پنپی، پھلی پھولی اور ترقی یافتہ زبان بنی، یہ وہ دور تھا جب کہ ابھی اقتدار مسلمانوں کے ہاتھ میں تھا اور ان کا کلچر ہی رائج وغالب کلچر تھا، دوسرا اختلاف یہ ہے کہ اس زبان نے اپنے لغوی اور فکری سرمایہ میں ترکی، فارسی، عربی، ہندی اور سنسکرت جیسی دیگر زبانوں سے کافی مدد لی ہے، اور ان زبانوں کے الفاظ حسب ضرورت اس میں منتقل ہوئے اور ان سب کے اختلاط وآمیزش سے اردو زبان عالم وجود میں آئی، اس کی کتابت میں فارسی رسم الخط اختیار کیا گیا، پھر دوسری زبانوں سے منتقل ہونے والے الفاظ اردو میں آکر ہندوستانی ماحول میں ڈھل گئے، اور انہوں نے ہندوستانی لب ولہجہ اور اسلوب اختیار کرلیا اور ان پر یہاں کا مقامی رنگ چڑھ گیا۔

اردو زبان مسلمانوں کے دورِ عروج وعہدِ قوت واقتدار میں اور اسلامی ماحول کے برتری وبالادستی کی فضا میں پروان چڑھی، خاص طور پر شمالی ہند اور دکن کی اسلامی ریاستوں میں اس کو زیادہ برگ وبار حاصل ہوا، جس کے نتیجہ میں اس زبان پر اسلامی رنگ پختہ ہوا اور اس پر اسلامی ثقافت کی چھاپ پڑی، اور اسلامی تعبیرات واصطلاحات زبان کے بنیادی اجزاء قرار پائے، مولانا حکیم سید عبدالحی حسنیؒ اپنی کتاب ''اسلامی علوم وفنون ہندوستان میں'' میں اردو زبان کی پیدائش اور نشو ونما کی تاریخ پر روشنی ڈالتے ہوئے فرماتے ہیں:

''ہندوستان کی اصل زبان سنسکرت ہے، اور ہندوؤں کے عقیدہ کے مطابق اس زبان میں ان کی چار آسمانی اور مقدس کتابیں ہیں لیکن روزمرہ اور

عام بول چال کی زبان دوسری ہے، جو ہندوستان کے بڑے حصہ میں بولی جاتی ہے اور اس کو ''بھاشا'' زبان کہتے ہیں، جب ہندوستان میں اسلام کی اشاعت ہوئی اور عرب وعجم سے یہاں مسلمانوں کی آمد ہوئی تو عربی، فارسی، ترکی اور ہندی زبانوں کے اختلاف وآمیزش سے ایک نئی زبان پیدا ہوئی اور اس کو'' اردو'' کہا جاتا ہے، یہ زبان بتدریج ترقی کرتی رہی، یہاں تک کہ شاہ جہاں کے زمانہ میں یہ فصاحت وبلاغت کے اچھے معیار پر پہنچ گئی، ابتدا میں دہلی اور اس کے اطراف کے لوگوں کا میلان فارسی شاعری کی طرف تھا، اور اردو شاعری میں شعر گوئی کا رجحان نہیں تھا، بیجاپور کے ابراہیم عادل شاہ کو موسیقی اور ہندی زبان سے بہت گہرا تعلق تھا، اور اس نے ہندی زبان میں کچھ کتابیں بھی تصنیف کی ہیں، اس کے پاس اس کے زمانہ کے علوم ومعارف کا بڑا حصہ جمع ہوگیا تھا، اور لوگ اس سے فائدہ اٹھاتے تھے، یہ حالت ابراہیم عادل شاہ کے لڑکے محمد عادل شاہ اور پھر ان کے لڑکے علی عادل شاہ کے زمانہ تک قائم رہی، علی عادل شاہ کو اردو زبان سے بڑی دلچسپی تھی، اس لئے اس کے زمانہ میں لوگ اس زبان کی طرف زیادہ مائل ہوئے، اور اس زبان میں اشعار کہنا شروع کیا''

دکن میں اردو کا آغاز ۷۱۲ھ مطابق ۱۳۱۲ء میں علاء الدین خلجی بادشاہ دہلی کے عہد میں ہوا، اس میں کوئی شک نہیں کہ اردو زبان کی ایجاد کا سہرا پنجاب کے سر ہے اور شاعری وتصنیف کا طرہ شمالی ہند کے سر، لیکن دکن نے اردو کی اتنی قدر کی کہ چودھویں صدی عیسوی سے اٹھارویں صدی عیسوی تک نظم ونثر کی صدہا کتابیں تیار کردیں جن میں شعر وسخن اور علم وفن کی مختلف اصناف شامل ہیں، سلطنت بہمنی (۱۳۴۷ء-۱۵۲۶ء) میں اردو کی سب سے قدیم کتاب ''معراج العاشقین'' مصنفہ خواجہ بندہ نواز سید محمد گیسودراز شائع ہوئی، اور سلاطین بہمنی نے اردو کو دفتری زبان بنادیا، جس سے اردو زبان کو تقویت حاصل ہوئی، سلطنت عادل شاہی (۱۴۹۰ء-۱۶۸۶ء) کے اکثر شاہان خود عالم وشاعر اور قدردان تھے، ابراہیم عادل شاہ ثانی کے زمانہ میں اردو زبان دکن میں عام ہوگئی تھی، اس دور میں شعراء

کی تعداد زیادہ تھی، تاہم مصنفین نثر بھی موجود تھے، جن میں شمس العشاق شاہ میراں جی ممتاز ہوئے، ان کی تصانیف نثر میں شرح مرغوب القلوب، جلترنگ اور گل باس قلمی موجود ہیں، سلطنت قطب شاہی (۱۵۱۰ء-۱۶۸۷ء) شاہان بھی اردو کے قدرداں تھے، تین بادشاہ اردو کے شاعر اور صاحب دیوان تھے اس دور میں نثر کی کتابیں بھی لکھی گئیں، اور گزشتہ دونوں عہدوں سے بہتر لکھی گئیں، مشہور مصنفین میں شاہ میراں جی خدانما صاحب "شرح تمہید ہمدانی" مولانا عبداللہ صاحب احکام الصلوۃ، ملا وجہی صاحب "سب رس" اس کا دوسرا نام "قصہ حسن ودل" ہے، اور میران یعقوب صاحب ہیں جنہوں نے شیخ برہان الدین اورنگ آبادی کی کتاب "شمائل الاتقیاء" کا اردو میں ترجمہ کیا، اس کے بعد مغلیہ کے دکن میں اردو کی ترقی اور تصانیف نظم ونثر کا سلسلہ جاری رہا اور عہد مغلیہ کے بعد کے دور میں بھی دکن میں اردو زبان کی ترویج وترقی کا سلسلہ جاری رہا۔

رام بابو سکسینہ نے دکن میں اردو زبان کی ترقی کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ

> یہ سب اسباب مل کر اس کا باعث ہوئے کہ دیسی زبان جو دکنی کے نام سے مشہور تھی، وہ ترقی کر کے ایک ادبی زبان بننے کے قابل ہوگئی، اس کے علاوہ ملک دکن میں اکثر بزرگان دین اور اولیاء اللہ بھی رہتے تھے جو ہندو اور مسلمانوں کی زبان اور مذہب میں کوئی فرق نہیں کرتے تھے، یہ لوگ عوام الناس کے ساتھ میل جول کے خیال سے دیسی ہی زبان کو پسند کرتے تھے چنانچہ اکثر قدمائے اردو صوفی منش اشخاص تھے ان سب کے اشعار بہت صاف اور عام فہم زبان میں ہوتے تھے۔

دکنی ادب کی روایات سقوط گولکنڈہ اور زوال بیجاپور کے بعد بھی جنوب میں ایک عرصہ زندہ ہیں، ارکاٹ کے نوابین نے شاعروں اور ادیبوں کی سرپرستی اور حوصلہ افزائی کی، اور ان کی اس علم پروری اور ادب نوازی کے باعث تامل کا علاقہ اس دور کا ایک اہم ادبی مرکز بن گیا، مدراس کے والا جاہی حکمرانوں اور بالخصوص ارکاٹ کے آخری نواب محمد غوث خان اعظم کا عہد اردو ادب کی نشو ونما کے لحاظ سے دور زریں کہا جاسکتا ہے۔

مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ کا اسلوب نگارش

حضرت مولانا کی شخصیت کے عناصر میں غالب عنصر ادب کا تھا، اور یہ ان کی تمام تحریروں کا جزو غالب ہے، اور جو چیز انہیں دوسرے ادباء سے ممتاز کرتی ہے وہ ان کی تحریروں میں ادب کے مختلف عناصر کا مناسب ہم آہنگی کے ساتھ اجتماع ہے۔ حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ نے ادب سے دعوت و تربیت اور انسانیت کی خدمت کا کام بحیثیت ایک خطیب، معلم اور مصنف کے لیا۔ ان کا ایک خاص اسلوب اور طرز ہے جسے ایک عرب ادیب نے ''ندوی اسلوب'' سے تعبیر کیا ہے۔ ان کی تصنیفات کا دائرہ بھی بہت وسیع ہے جو ادب کے مختلف موضوعات کا احاطہ کرتا ہے۔ حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کے یہاں ادب کا ایک خاص تصور ہے، وہ ادب میں جمود و تعطل اور تقلید و روایت پرستی اور لکیر کا فقیر بننے کے قائل نہیں ہیں، چنانچہ فرماتے ہیں:

> ''وہ ادب جس کو تقلید اور روایت سے سب سے زیادہ انکار اور لکیر کا فقیر بننے سے سب سے زیادہ عار ہونا چاہئے تھا، اور جس کے خمیر و سرشت میں جدت و جرأت، ذہانت، ذوق جمال اور ادب کی زبان میں ''حسن پرستی'' داخل ہے، اور جس کو بلبل کی طرح ہر گل کا شیدا اور مظہر جمال و کمال کا شیفتہ و فریفتہ ہونا چاہئے، اکثر موقعوں پر روایت پرستی اور تعصب کا شکار، رسم و رواج میں گرفتار نظر آتا ہے۔ ادب و انشاء کی جو تعریف استاد ازل نے کردی، اور اس کے جو حدود، خطوط کھینچ دیئے، بہت کم ادیبوں اور نقادوں کو ان سے سرتابی کرنے اور اس کے دائرہ سے باہر قدم رکھنے کی جرأت ہوتی ہے، اس کا نتیجہ ہے کہ ہر بعد میں آنے والا اپنے پیش رو کے

قدم پر قدم رکھتا ہوا اپنا سفر طے کرتا ہے، اور ادبی نمونوں کے ذخیروں میں کسی اضافہ، کسی تغیر اور کسی ترمیم کی جرأت نہیں کرتا، ادب وانشاء کی چند مثالی شخصیتیں منتخب کرلی جاتی ہیں، اور ہر آنے والا اسی سبق کو دہراتا ہے۔

اقبال کا یہ مصرعہ اس دبستان ادب پر پوری طرح صادق آتا ہے ع

کند مکتب رہ طے کردہ راطے"

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ مجدد ادب تھے، آپ کا ادبی سرمایہ نثر کی کسی ایک صنف میں محدود نہیں ہے، بلکہ آپ واعظ وخطیب، قصہ نویس، نقاد، سیرت نگار اور مؤرخ سبھی کچھ تھے، آپ نے سفرنامے بھی لکھے ہیں۔ اور ان تمام اصناف میں آپ کا ایک منفرد اور ممتاز اسلوب ہے، وہ مختلف موضوعات پر قلم اٹھانے کے باوجود قدیم ادب کی چاشنی اور حلاوت، شکوہ اور شوکت، اور جدید ادب کی رقت ولطافت، نزاکت وسہولت اور موضوعیت وعلمیت کے جامع تھے، اور اس میں امیر شکیب ارسلان کے علاوہ ان کا کوئی ثانی نہیں تھا۔ اسی جامعیت کی طرف ڈاکٹر عبدالباسط بدر حضرت مولانا کی کتاب " نظرات في الأدب " پر اپنے مقدمہ میں تحریر کرتے ہیں:

"یہ صحیح ہے کہ بہت سے لوگ ادب وفکر دونوں کے جامع ہیں، کیونکہ ہمارے دور کی ایک اہم خصوصیت کشمکش کی حد تک ادب وفکر کا تداخل ہے، اور بہت سے حضرات کے یہاں ادب اور دعوت الی اللہ کا اجتماع پایا جاتا ہے، چنانچہ کوئی بھی اسلامی ملک اسلامی ادباء سے خالی نہیں ہے، اور معاصر ادباء میں بھی ایسے حضرات کی کمی نہیں ہے جو ادب اور فکر دونوں کے جامع ہیں۔ لیکن جو حضرات بیک وقت ادب، فکر اور دعوت کی تین سنہری کڑیوں کے جامع ہیں ان کی تعداد ہمارے اس دور میں بہت کم ہے، ان میں ڈاکٹر محمد اقبال، سید قطب اور اس کتاب کے مصنف (حضرت مولانا ندویؒ) کا نام لیا جاسکتا ہے۔

مزید لکھتے ہیں:

''مولانا سید ابوالحسن علی ندوی میں عالمی اسلامی ادیب کی خصوصیات جمع ہوگئی ہیں، وہ عربی اور اردو و فارسی تینوں زبانوں کے ادیب ہیں، آپ وہ رجل منتظر ہیں جن کی ہمیں تلاش تھی، اللہ تعالیٰ نے ان کے اندر یہ صفات رکھی ہیں تاکہ ان کے ذریعہ اسلامی ادب کو تقویت حاصل ہو، وہ اس موجودہ دور میں بھی ادب کا پرچم بلند کئے ہوئے ہیں جو محدود قومیتوں اور دین و مذہب کو ادب و فکر اور سیاسیات و معاشیات اور زندگی کے عملی گوشوں سے جدا کرنے کا قائل ہے، چنانچہ اس مردمؤمن نے اپنی ایمانی حرارت اور جوش سے مختلف قومیتوں اور زبانوں کے اسلامی ادباء کا پہلا اجتماع بلایا، اور ان ہی کی رہنمائی اور سرپرستی میں دور جدید ہی کی نہیں، بلکہ پوری امت مسلمہ کی تاریخ کی پہلی ادبی اسلامی تنظیم قائم ہوئی، مجھے اس وسیع و عریض اور طویل تاریخ میں ایسی کوئی تنظیم معلوم نہیں جس میں ہندوستانی، عربی، ترکی، انڈونیسی سب ایک مقصد اور ایک عملی طریقۂ کار پر متحد ہوں، مولانا کے رابطہ ادب اسلامی کی سرپرستی قبول کرنے سے پہلے اسلامی ادباء کا ایسا اجتماع اور اتحاد دنیا نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔''